عجائب خانۂ عشق
الیاس سیتاپوری
منتخب تاریخی کہانیاں
PDFBOOKSFREE.PK
داستان گو
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

الیاس سیتاپوریؒ

کی

منتخب تاریخی کہانیاں

کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ۔ سعید منشن بلموریا اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی ۱۔

پاکستان اور بھارت سے ایک ساتھ شائع ہونے والا مجموعہ

مصوّر: اقبال مہدی
ناشر: کاشف الیاس
باردوم: ۱۹۸۸ء
قیمت: ۴۰ روپے
مطبوعہ: شکیل پرنٹنگ پریس آرام باغ، کراچی
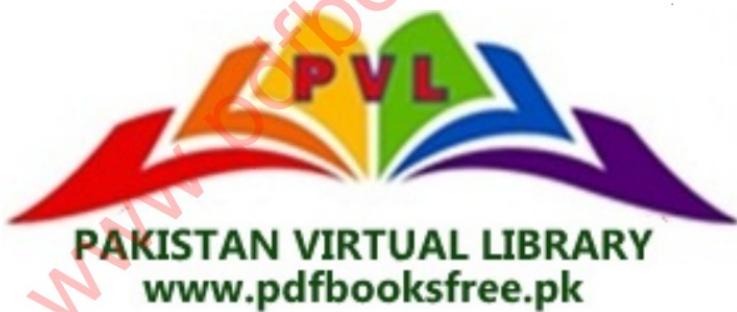
واحد تقسیم کار:
کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

۲۰

لوگ کہتے ہیں کہ تلوار کا زخم تو بھر جاتا ہے مگر زبان کا گھاؤ ہمیشہ ہرا رہتا ہے لیکن اس کہانی کا مرکزی کردار گھنگھروؤں کا زخم خوردہ ہے۔ اور یہ گھاؤ بھی ہمیشہ ہرا رہا۔ تاریخ اور رومان کا امتزاج۔

۵۷

اس پہلے شخص کی داستان، جو نظریۂ اشتراکیت و اشتمالیت کا بانی تھا۔ وہ خود تو مر گیا مگر اس کے افکار و عقائد انسانی ضمیر اور روح میں ہمیشہ زندہ رہے۔ وہ آج بھی موجود ہے کیونکہ جب تک اس کے افکار موجود اور زندہ ہیں وہ بھی زندہ اور موجود ہے

۱۰۲

سکندر اعظم اور اس کے ہم عصر ایک عظیم مجسمہ ساز کی داستانِ عشق۔ انسان کے جذبوں محرومیوں اور کامرانیوں کی جلیل و جمیل تصویریں۔ عشق جو روح میں تھا۔ جسم مر گیا مگر عشق کی کارفرمائی پھر بھی جاری رہی وہ پتھر میں منتقل ہو کر اپنا کام کر گزرا

تاریخی پس منظر میں غیر تاریخی کہانی۔ پُر اسرار ناقابلِ توجیہ۔ عقلی اور فکری اساس سے ماورا۔ دلچسپ اور پُر اثر۔ تحیّر اور تجسّس سے بھرپور کہانی۔

ادریس صدیقی

قصہ پانچویں درویش کا

الیاس سیتاپوری نے جب مجھ سے کہا کہ میری کتاب پر مقدمہ لکھ دو تو میرے دل نے برجستہ یہ جواب دیا کہ "مقدمہ لکھنا کیسا۔ اس شخص پر تو مقدمہ چلانا چاہیے، کھلی عدالت میں۔ تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ غضب خدا کا۔۔ اس ظالم نے ہماری ساری تاریخ کو افسانہ و افسوں بنا کے رکھ دیا اور دندناتا پھر رہا ہے بیچ اس مملکتِ خداداد پاکستان کے۔۔ اس کی کہانیوں میں افسانہ حقیقت معلوم ہوتا ہے اور حقیقت افسانہ۔۔ اس نے ہمارے بہت سے بزرگوں کی روحوں کو شرمندہ کیا ہے۔۔ ہم اسے معاف نہیں کر سکتے۔"

ہمارے اس جذباتی ردِعمل پر عقل یہ سوال کرتی ہے کہ افسانہ اور حقیقت۔ کیا واقعی دو مختلف اور متضاد چیزیں ہیں، کیا ہر افسانے کی بنیاد کسی نہ کسی ننھی سی حقیقت پر نہیں ہوتی اور کیا ہر حقیقت وقت گزرنے کے ساتھ افسانہ نہیں بن جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم سب دراصل اُن کہانیوں کے کردار ہیں جو آئندہ لکھی جائیں گی۔۔ البتہ اگر کہانی نویس کسی بنیادی حقیقت کو مسخ کرے تو معاشرے کو حق پہنچتا ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑے لیکن حقیقت کا سراغ آسان نہیں۔ بے شمار ظاہری حقیقتوں پر روایتوں اور عقیدتوں کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں اور بقول باقی صدیقی ؎

اُٹھتے اُٹھتے اُٹھیں گے پردے صدیوں کا غبار درمیاں ہے

پہلے میرا بھی جی یہی چاہتا تھا کہ الیاس کی کہانیوں پر یقین نہ کیا جائے لیکن ان کی خارجی شہادتیں ایسی مضبوط ہوتی ہیں کہ ناقابلِ یقین حد تک قابلِ یقین بن جاتی ہیں۔

الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانیاں جہاں بے شمار لوگوں کے لئے وسیلۂ مسرت ہیں وہاں بعضوں کو کچھ اعتراضات بھی ہیں جن کا جواب دینا میرے فرائض میں شامل نہیں۔ لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ تفریحی ادب ایک فطری چیز ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں۔ اب یہ معاشرے کی اپنی روایتی قدروں کی کمزوری یا مضبوطی پر منحصر ہے کہ تفریحی ادب کس کس بندش کو ڈھیلا کر سکتا ہے یا توڑ سکتا ہے۔۔ بہرحال الیاس صاحب جنس کے پُل صراط سے گزرتے دم خاصی احتیاط سے کام لے رہے ہیں اور ابھی وضع احتیاط سے اُن کا یا کسی اور کا دم گھٹنے کی نوبت نہیں آئی۔ انھوں نے گفتنی اور ناگفتنی کے فرق کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اُن کی بڑی مہربانی ہے اور اس پر

ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ورنہ ان کا موضوع ایسا ہے جس میں پاکیِ داماں کی ہر حکایت دا...
اور بندِ قبا سے آگے نکل جانا چاہتی ہے۔

شکایت اور شکایت کا یہ معاملہ نیا نہیں ہے۔ پہلے بھی ہمارے نزد جس معاشرے نے کئی ادیبوں کو نہایت دلچسپ کرب کے ساتھ برداشت کیا ہے۔ مرزا شوق سے سعادت حسن منٹو تک سب نے معاشرے کو تنگ ہی کیا ہے اور تھے بھی یہ لوگ عجیب۔ مرزا صاحب کو اپنی محبوبہ کے ہاتھوں ایسی لذت محسوس ہوتی تھی کہ وہ اسے رخصت کرنے سے پہلے کل کے لئے اُس سے پیشگی پان لگوا لیتے تھے اور یہ منٹو صاحب، اللہ جانے کون سی عینک لگاتے تھے کہ انہیں اکثر غلاظت کے ڈھیر میں ہی نیکی کی کرن نظر آتی تھی۔ کلاسیکی ادب میں ہماری قوم ابھی تک قصہ چہار درویش اور فسانہ عجائب پڑھنے پر مُصر ہے اور کئی جغادری نقادوں نے ان بے سروپا کہانیوں کی دلدل سے علم و اخلاق ایسے آبدار موتی نکالے ہیں کہ اپنی آنکھوں کا اعتبار بھی جاتا رہا۔ لیکن ہم مُردہ ادیبوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور زندوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ مُردوں کو پکڑنا ویسے بھی مشکل اور خطرناک ہے ـــ بہرکیف جب آپ نے چار درویشوں کی کہانیاں سُنی ہیں تو پانچویں درویش کی بھی سُنیئے۔ اس کا نام الیاس سیتاپوری ہے۔

وقت کے ساتھ ہماری ادبی اور معاشرتی قدریں کافی بدلتی جارہی ہیں۔ اب مثنوی زہرِ عشق کو تکیوں کے نیچے چھپا کر پڑھنے کا زمانہ نہیں رہا کیونکہ اس معاشرے میں عشق کوئی سرِ مکتوم یا متعدی مرض نہیں رہا۔ اب معاشرے کا ہاضمہ خاصا مضبوط ہے وہ سب کچھ ڈائجسٹ کرلیتا ہے اور اس کی ذہنی صحت میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس دور میں ادیبوں نے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھول رکھے ہیں، لوگ اپنی اپنی پسند کی چیزیں خود جھولی میں ڈال لیتے ہیں ـــ سب کے گریباں چاک ہیں، کسی کو کسی کے گریباں میں جھانکنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

خود ہم نے الیاس صاحب کی کہانی "صوفی کا انجام" پڑھی تو انہیں لکھا کہ خدا گواہ ہے ایمان تازہ ہوگیا اسے پڑھ کر ـــ ہم ٹھہرے اوسط درجے کے مسلمان اور مسلمان کے پاس ایمان اور حقّہ۔ یہی دو چیزیں ہیں جنھیں وہ برابر تازہ کرتے رہتے ہیں۔ یوں تو ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں۔ جنھوں نے ان کہانیوں سے ڈر کر نمازیں پڑھنی شروع کردیں ہیں اور بقیہ زندگی توبہ و استغفار کے لئے وقف کردی ہے ـــ گویا کہانیاں کیا ہیں، قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔

کہنے کو ہزار باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن الیاس سیتاپوری کا فن کچھ ایسا پُراسرار بھی نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ انھوں نے تاریخ کے بہت سے محمودوں اور ایازوں کو ایک ہی صف میں انسانی سطح پر کھڑا کر کے دیکھا اور ان کے جذبوں اور ان کی فطرتوں میں جھانکا تو انھیں کچھ اور ہی جلوہ نظر آیا۔ یہی جلوہ کہانی کا مرکز اور محور ہے ـــ شاید کوئی یہ ارشاد فرمائے کہ تاریخ میں حسن و عشق کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یقیناً یہ بات درست ہے لیکن کہانی نویس کا مرکزِ نگاہ کچھ اور ہے۔ ظاہر ہے اسے مغلیہ تاریخ میں اکبر کے نظام مالگزاری سے تو دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ بھلا اسے راجہ ٹوڈرمل سے کیا ملے گا۔ لامحالہ اس کی نظر انارکلی پر ہی مرکوز ہوگی ـــ الیاس صاحب نے تاریخ سے خشکی اور زندگی سے تلخی کو نکال دیا ہے۔ تاریخ کے علاوہ جغرافیے کو بھی اُن کی کہانیوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ قاری کو جس جغرافیائی خطے اور تاریخی عہد میں لے جاتے ہیں اس کا مکمل

عہد اور شعور رکھتے ہیں اور اس کا سبب ان کا وسیع اور گہرا مطالعہ ہے۔

الیاس ناممکن آدمی ہیں۔ ان کے کسب کمال اور صرف کمال کی داستان انوکھی اور ناقابلِ تقلید ہے ان کی طرح علم کے بنیادی مآخذ کی تلاش کم ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا شوق اور ہمت کی اعلیٰ مثال ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ داستانوں سے شہزادوں کے کتب خانوں کی شان رکھتا ہے۔ شہزادوں کا پڑھنا تو محلِ نظر ہے لیکن الیاس غیر معمولی آدمی ہیں وہ پڑھتے بھی ہیں اور اس قدر کہ لکھنے کا وقت خدا جانے کہاں سے نکالتے ہیں۔

الیاس سیتاپوری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے رنگ اور رائٹنگ کے لکھنے والوں میں سب سے اچھی زبان لکھتے ہیں اس کی ایک وجہ تو ان کا گہرا کلاسیکی مطالعہ ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ترجمہ کرنا نہیں جانتے۔ میں اسے تخلیقی مصنف کی بڑی خوبی تصور کرتا ہوں۔ تفریحی ادب کے اکثر لکھنے والے ترجموں کے آفریدہ اور پروردہ ہوتے ہیں اسی لئے ان کا اپنا لکھا ہوا دوسرے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ الیاس صاحب کو زبان پر قدرت حاصل ہونے کے باعث اپنی تحریر کا انداز پکا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ ان کا طرز بنیادی طور پر افسانوی ہے۔ ان کی تحریروں میں گوند اور شہد کا مِلا جُلا مزہ ہے۔ قاری ان سے چپک سا جاتا ہے۔ میں نے جب ان کی کہانیوں کی کتاب "کشمیر کی کلی" پڑھی تو بے ساختہ اصغر کا یہ شعر زبان پر آ گیا۔

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی   کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

اور یہ شعر لکھ کر میں نے ان کی کہانیوں پر اپنا تبصرہ مکمل کر دیا ہے۔ اب کہنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ علم اگر واقعی دولت ہے تو ہر دولت کی طرح اس پر بھی ٹیکس اور زکوٰۃ واجب ہے۔ اُمید ہے کہ الیاس صاحب معاشرے کا یہ قرض قسط وار اور دیانت داری سے ادا کرتے رہیں گے۔ انھوں نے ایک طرزِ خاص ایجاد کی ہے لیکن یہ حرفِ آخر نہیں ہونا چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ وہ ماضی سے فرصت پانے کے بعد حال اور مستقبل پر بھی ایسی ہی گہری نظر ڈالیں اور کہانیاں پڑھنے والوں کو ایک نئی دنیا دکھائیں۔

الیاس کی تاریخی کہانیوں کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ کئی لوگوں نے اس طرزِ خاص کو اپنانے کی کوشش کی ہے لیکن شاید ابھی تک کوئی بھی نقل بمطابق اصل نہیں کر سکا۔ بات یہ ہے کہ محض لمبی داڑھی رکھ لینے سے کوئی سرسید نہیں بن سکتا۔ ہر منفرد اندازِ تحریر کے پیچھے ایک منفرد ذہن کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ہر نقشِ قدم کے آگے کوئی تیز رَو سرگرمِ سفر ہوتا ہے۔ اس کٹھن راہ پر چلنا تو بہت سے چاہتے ہیں لیکن جلد ہی وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ:۔

خون کے چھینٹے، ہر اک نقشِ قدم سے پہلے   کیا کوئی اور بھی گزرا ہے یہ ہم سے پہلے

احمد ہمیش

الیاس سیتاپوری اور خالِص مشرقی فکشن

جی ہاں، اِس صنعتی عجلت پسندی کے زمانہ میں، جب کہ کہانی سے قاری کے جذبات کو تسکین دینے یا کتھارسِس کرنے والے فِکشن کا تصوّر محال ہے۔ تو ایک ہی اور ایک ہی نام خالص فِکشن کی مثال بن کر ظاہر ہوا ہے اور وہ ہے الیاس سیتاپوری۔ مگر خالص فِکشن کیا ہے اور یہ اُردو زبان میں الیاس سیتاپوری تک کیسے پہنچا؟ — یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ پھر بھی اسے سمجھنا کہانی کے قاری کی ضرورت ہے مگر الیاس سیتاپوری اور اُس کے فِکشن پر اپنی بات شروع کرنے سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اُردو کے افسانوی ادب کی ابتلا کا مختصر جائزہ لیتا چلوں۔ میں یہ کہنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا کہ اُردو افسانوی ادب کی تاریخ میں پریم چند کے بعد خالص فِکشن کی مثالیں نایاب ہو گئیں۔ احمد علی اور عزیز احمد کی تو ایک خوبی یہ تھی کہ مغربی فِکشن سے تکنیکی تنوع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے ساتھ ایک ذمّہ داری قبول کی تھی کہ کسی نہ کسی صورت فِکشن ضرور باقی رہے۔ اگر خالص صورت میں نہیں تو کم سے کم مغربی فِکشن کی آمیزش کی صورت میں۔ انفرادی طور پر تو یہ دو مذکورہ نام اُردو کے افسانوی ادب کے بڑے نام ہیں مگر اِن سے ہٹ کر ترقی پسند تحریک سے منسلک اُردو کے افسانہ نگاروں کا تو بس اتنا سا رول ہے کہ اُنھوں نے مارکس کی تھیوری اور پارٹی لائن پر اک طرفہ طبقاتی اور معاشرتی شعور کے پیرایوں اور اصطلاحات کو ری پروڈیوس (REPRODUCE) کیا۔ ترقی پسند تحریک کی مثال ایک مصنوعی پہاڑ کی تھی، جو خود ساختہ معاشی معاشرتی اور سیاسی مسائل کے مرکب سے بنایا گیا تھا اور اس مصنوعی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بہت سے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے قد کو بلند کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بھول گئے تھے کہ کبھی وہ مصنوعی پہاڑ اپنے جھوٹ سمیت نیچے آ رہے گا اور تب اُن کے وہ اصل قد سامنے آئیں گے، جو مصنوعی پہاڑ کے قد سے ٹِکے ہوئے تھے۔ ایک 'الوژن' تھا عوامی شعور سے ڈائریکٹ رابطہ کا، جو ترقی پسند تحریک کے خاتمہ کے بعد بھی رہا۔ اسی 'الوژن' نے کرشن چندر کو کرشن چندر، بیدی کو بیدی، اور احمد ندیم قاسمی کو احمد ندیم قاسمی بنا لیا ہے۔ اور بھی کچھ ایسی ہی مثالیں ہیں۔ لیکن اگر ان کی ذاتی زندگی اور ذاتی تجربوں کو 'فِلٹر' کر کے نکالا جائے تو بڑی مایوسی ہو گی۔ در اصل ان سب نے عام

پڑھنے والوں پر کرپٹ اثرات ڈال کر شہرت حاصل کی۔ یہ لوگ اپنے حالات سے زیادہ 'ایمرجینسی' کی پیداوار تھے۔ 'ایمرجینسی' ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ ترقی پسند افسانوی تحریروں میں معاشرتی وژن کم اور معروفی اعداد و شمار زیادہ تھے۔ یوں ایک عرصہ بعد پڑھنے والوں پر منکشف ہوا کہ معاشرتی وژن کا بڑا حصہ تو پریم چند اپنے ساتھ لے گئے۔ دراصل پریم چند نے جو زندگی گزاردی، وہ کوئی باہر کی معاشرتی بھیوری کو اوڑھ کر نہیں بلکہ ڈائریکٹ ہندوستانی معاشرہ کی حقیقی المناکیوں میں رہ کر۔ وہ اپنے کرداروں کے دُکھوں میں اس طرح شریک ہوتے، جیسے اچھا ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرتے ہوئے انہماک کے اِس عالم میں ہوتا ہے کہ اُس کو اپنی صحت کی پروا نہیں ہوتی۔ اپنے کرداروں کے لئے خود کو وقف کر کے پریم چند نے مشرقی داستان گوئی کے عہد کی اُس خصوصیت کو برقرار رکھا جو داستان گو اور داستان سُننے والوں کے درمیان سب سے بڑی اخلاقی قدر تھی۔ پُر رونق محفلوں میں پُرسکون رُوح والے داستان گو داستان سناتے اور سُننے والے زندگی کے تمام مصائب اور تلخیوں سے بے نیاز ہو کر داستان کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتے اور محویت کا یہ عالم ہوتا کہ داستان سُننے کے دوران وقفوں کا احساس اِس پُرمسرت اصرار سے ہوتا کہ "پھر کیا ہوا؟" یہاں تک کہ داستان گو داستان کا اختتام ٹھیک اُس موقع پر کرتا، جب سُننے والوں کو پُوری تسلی و تشفی مِل جاتی۔ اُردو میں 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کی روایت تو مشرق کی تمام داستانوں کی ایک کڑی تھی اور ان داستانوں کا ماخذ آسمانی کتابوں کی حکایتیں اور تمثیلیں تھیں۔

اِن سے اعلیٰ ترین سطح پر انسانی ضمیر اور باطن کی تہذیبوں نے جنم لیا۔ پھر درمیانہ سطح پر ان سے ماخوذ داستانوں نے عام معاشروں کی تعمیر میں مدد دی اور نچلی سطح پر اس کی ایک کڑی، اُن لوک کہانیوں سے جا ملتی ہے جو ہم نے بچپن میں اپنی ماؤں اور گھر کے دیگر بزرگوں سے سُنی تھیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ جب کہانی یوں شروع ہوتی کہ "ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ"۔ تو اِس کا صرف ایک مقصد تھا کہ بچوّں کے معصوم ذہن میں بادشاہ اور اس کی بادشاہت کا کوئی غلط خاکہ نہ بن جائے۔ بلکہ اس کے باطن میں تمام دُنیاوی بادشاہوں کا ایک آسمانی بادشاہ رہ جائے یعنی خدا۔ یوں کہانی جاری رہتی اور اُس کے سُننے کے دوران معصوم محویت کے جذبہ سے ہنکاری بھری جاتی تاکہ کہانی سُنانے والی بزرگ محبت کے احترام کی شرط برقرار رہے۔ یہاں تک کہ کہانی کا اختتام ٹھیک ایسی جگہ ہوتا، جہاں بچوّں کی ہنکاری بھرنے والی بیداری مطمئن اور پُرسکون نیند میں منتقل ہو جاتی۔ غرض کہ اعلیٰ ترین سطح سے نچلی سطح پر مقصد کی نوعیت ایک تھی..... کہ انسان کو اُس لاشعوری تہذیب کے قریب رکھنا جو اللہ کے فرمان کی تکمیل میں مدد دے۔ اللہ کے فرمان میں جلال و جمال کی مناسبت اس کی رضا ہے۔ اِس رضا کا پیغام دینے کے لئے اللہ نے زمین پر اپنے رسُول بھیجے اور رسُولوں نے انسانوں کو ایسی حکایتیں اور تمثیلیں سُنائیں، جن میں گنہگاروں کے لئے عبرت ہوتی، ظالموں، جابروں اور مرتدوں کو عذابِ الٰہی سے خوف دلانا ہوتا اور نیک اور اعلیٰ صفات بندوں کے لئے بہشت کے جمال کی بشارت ہوتی۔ مگر شیطان نے مغرب کو رضائے الٰہی سے بھٹکا کر "قوتِ حیات" سے مالا مال کرنے کا فریب دیا

اور تب۔ تمام عقل و شعور کے فلسفوں نے آدمی کا خدا سے ناطہ توڑ دیا اور مادی اسباب کی یلغار نے سچائی، نیکی اور خوبصورتی کے تصورات کو دبا دیا۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ۔ یہی ناکہ انسان پر سائنسی برتری اور ٹیکنالوجی کی کثرت کے پسِ پردہ غیر انسانی نظام مسلط کر دیئے گئے۔ یہاں تک کہ مغرب کے آرٹ میں بھی منفی تصوریت کی ایک ایسی دنیا آباد کی گئی جس میں انتہائی غیر انسانی رویوں کو طرح طرح کے اسٹائلش ماڈرن کر دینے والے فیشنوں کی شکل دی گئی۔ مغرب کا فکشن اور خاص کر پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران کا فکشن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ بلکہ فارم پرستی کے پے درپے رجحانات نے مغربی فکشن سے واقعیت، کی بچی کھچی صلاحیتیں بھی سلب کر لیں اور بہت ادنیٰ درجہ کے معاشرتی روزمرہ کے مسائل میں سسپنس، کی تلاش شروع کر دی مثلاً شارٹ اسٹوری، کی فارم جو یورپ میں بہت پہلے، موضوع دشمنی، کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔ وہ بعد میں چل کر صحافت کی نذر ہو گئی۔ برصغیر میں منٹو، شارٹ اسٹوری کی فارم کا بے حد دلدادہ تھا اور زندگی کے ہر واقعہ کو فرائڈ کی نفسیات کے پیمانہ سے دیکھتا تھا اور یوں اُس نے بڑی کامیاب کہانیاں لکھیں۔ مگر اُس کی ہر کہانی میں آخری سطریں ایسے سفاکانہ تجسس پر ختم ہوتیں کہ بے چارا قاری لہولہان ہوئے بنا نہ رہتا۔ خود منٹو اس عمل کو اپنا فن سمجھتا تھا اور وہ بڑے فخر سے بتایا کرتا کہ وہ افسانے کیسے لکھتا تھا؟ دراصل یہ، کیسے لکھنے، والی روش اُردو میں پریم چند کے بعد ہی آئی۔ بعد کے لکھنے والے نے کہانی لکھتے ہوئے 'پھر کیا ہوا؟' کے پُرمسرت اصرار کی جگہ عقلی رویہ اور تجسس کی نسبت سے کیسے ہوا، کا رویہ اختیار کیا۔ حالانکہ پریم چند نے بے پناہ معاشرتی شعور کے باوجود اپنی کہانیوں اور ناولوں میں مشرقی داستانوں کے اُس منصب کو برقرار رکھا تھا، جو داستان سُننے والوں کو روحانی مسرت بہم پہنچاتا تھا۔ بدقسمتی سے یہ منصب پریم چند کے بعد بے وقعت ہو گیا۔ کسی نے بھی اسے قبول نہیں کیا۔ یوں پریم چند کو احترام کی سُولی پر چڑھا کر لوگ تکنیک اور اسٹائل کی بحثوں میں پڑ گئے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی یہ بحثیں جاری رہیں اور جو کچھ یورپ اور امریکہ میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہوا، اُسے وہاں لکھا بھی گیا اور پہلے سے لکھے ہوئے کو 'ری پروڈیوس' بھی کیا گیا۔ مگر ہندوستان پاکستان میں تو 'ری پروڈیوس' کو 'ری پروڈیوس' کیا گیا۔ لایعنی (ABSURD) کہانی اور اینٹی ANTI کہانی لکھنے والوں کی ایک کھیپ نکل آئی۔ مگر اس میں کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اپنی طبع سے لکھنا جانتا ہو۔ سب اپرنٹس نکلے اور تخلیقی اُپج ان میں نام کو بھی نہیں پائی گئی۔ فکشن کی بات کرنے والوں کے زمرہ میں لے دے کے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین رہ گئے۔ ان دو ناموں نے اپنے وقت میں بھی اور حال کے عرصہ میں بھی خوب لکھا۔ مگر ایک کے یہاں فکشن میں مغربی تکنیکی آمیزش کا یہ عالم کہ پڑھنے والے کو دُور دُور تک مشرق کا رویہ نہیں ملے گا اور دوسرے کے یہاں محض مشرقی داستانی فریم ۔۔۔ مگر اندر سے داستان ندارد۔ انتظار حسین کے 'شہرِ افسوس' کا بڑا چرچا رہا مگر 'شہرِ افسوس' میں مشرقی پاکستان کے انقطاع کے وقت کی جس ابتلا کا ذکر ہے، وہ انتظار حسین کے ذاتی تجربہ میں بالکل نہیں آئی۔ جہاں تک ذاتی تجربہ کی سچائی کا تعلق ہے تو خود میں نے اپنی طویل کہانی

"مکھی" میں وہی کچھ لکھا، جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا مگر میں کبھی وہ حق نہ ادا کر سکا۔ جس سے
خالص فکشن کے منصب کو تقویت ملتی۔ غور سے دیکھا جائے تو پریم چند کے بعد ۳۶ سال سے زیادہ
کے اس گیپ میں اُردو افسانوی ادب میں انتشار رہا۔ ادبی رسائل میں بہت مدیر اور ملازم پیشہ
لوگوں کی بھی تحریریں چھپتی رہیں۔ مجموعی طور پر ادبی رسائل کا یہ حال ہو گیا کہ وہ محض ادب کا لیبل
لگا کے صفحات کو مُردہ تحریروں اور خاص کر مُردہ کہانیوں سے پاٹتے رہے۔ اس کے نتیجہ
میں ڈائجسٹ رسائل کا اجرا ہوا اور ہر ڈائجسٹ رسالے نے ایک دُوسرے کے مقابلہ میں ایسی کہانیاں
شائع کرنا شروع کر دیں جو زیادہ سے زیادہ پڑھی جائیں۔ پڑھنے والوں کے ذریعہ پتہ چلا کہ الیاس
سیتاپوری کی کہانیاں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ غالباً یہ کوئی اسی قبیل کا لکھنے
والا ہوگا، جو ایک فارمولا بنا کر تاریخی واقعات سے من گھڑت صُورت میں کہانیاں لکھ رہا ہو مگر
معلوم نہیں اندر سے مجھے کس خاص چیز نے اُکسایا کہ الیاس سیتاپوری کی کہانی پڑھو۔ تب میں نے
خود کو تیار کر کے الیاس سیتاپوری کی ایک کہانی "خانِ اعظم کا تحفہ" پڑھی۔ پوری کہانی پڑھنے کے
دوران مجھے کہیں اپنے انہماک میں کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ایک سوال میرے ذہن میں اُٹھا کہ بھلا
یہ کیسی کہانی ہے! اگر یہ تاریخی ہے تو اس طرح کی تاریخی کہانی تو میں نے کبھی نہیں پڑھی۔ ایسا تو کبھی
نہیں ہوا کہ تاریخ، کہانی میں منتقل ہو کر اس قدر اثرانداز ہو کہ اُس کی باطنی سچائی ظاہر ہونے لگے۔
پھر مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے یہ خوبی محض ایک کہانی تک ہی محدود ہو۔ شاید الیاس سیتاپوری کی
دوسری کہانیوں میں یہ خوبی نہ ہو۔ میں نے کچھ اور کہانیاں بھی پڑھیں اور غور سے پڑھیں۔ تب
مجھ پر ایک غیر معمولی انکشاف ہوا کہ گویا ذہن میں وہ انتشار ہی نہ رہا ہو، جس کا ذکر میں نے متذکرہ
بالا سطروں میں پریم چند کے بعد ۳۶ سال سے زیادہ عرصہ کے گیپ کے ضمن میں کیا ہے۔ ممکن ہے
میری طرح دوسروں پر یہ انکشاف نہ ہوا ہو مگر دُوسروں کی یہ پروا مجھے کب رہی کہ وہ بھی میری طرح
سوچیں۔ چھوٹی اہمیتوں کی گرم بازاری میں مَیں نے پڑھنے والوں کا بھی یہ حال دیکھا ہے کہ اُنھیں
اچھے بُرے، اہم غیر اہم کا فرق معلوم کرنے کا موقع ہی نہیں مِلتا۔ ایک طرف سے شکایت ہوتی ہے
کہ اُردو میں افسانہ کی تنقید کا رواج نہیں۔ کوئی بتا ہی نہیں سکتا کہ کہانی کیسی ہونی چاہیے! کون سا
ناول کس معیار کا ہے؟ پڑھنے والا دراصل کیا پڑھنا چاہتا ہے ۔۔ یہ بتانے والا کوئی شاید ہے ہی نہیں
اور اگر ہے تو سامنے نہیں آتا۔

جی ہاں، پچھلے دو سال سے میں اس کوشش میں تھا کہ کب مجھے اس کا موقع ملے کہ میں بہ حیثیت
احمد ہمیش لوگوں کو سامنے آ کے بتاؤں کہ کہانی کیسی ہونی چاہیے اور واقعی کہانی کیا ہوتی ہے! فکشن
کیا ہے اور موجودہ زمانہ میں فکشن کون لکھ رہا ہے! اور اگر کوئی لکھ رہا ہے تو کیسا فکشن لکھ رہا
ہے! کہیں اُس میں مغربی فکشن کی تکنیکی آمیزش تو نہیں! اور اگر ایسا نہیں تو مشرقی فکشن کی
روایت کے ناطے اُس کا تحریری رویّہ کس حد تک خالص ہے! ان سارے سوالوں کے تحت میں
نے خاصا مطالعہ کیا اور آخر مجھے موقع مِل ہی گیا۔ معلوم ہوا کہ الیاس سیتاپوری کی کہانیوں کا دُہرا

مجموعہ چھپ رہا ہے۔ تب میں اپنے ذاتی اشتیاق کے ناطے الیاس سیتا پوری کے گھر پہنچا اور اُس سے مِلا۔ پہلی نظر میں جس حقیقت نے مجھے متاثر کیا وہ تھی الیاس سیتاپوری کی بے پناہ مطالعے کی لگن۔ تین چار کمروں پر مشتمل گھر میں جگہ جگہ کتابوں کے انبار نظر آئے۔ زیادہ تعداد تاریخ اور فلسفۂ تاریخ سے متعلق کتابوں کی تھی۔ یوں مجھ پر انکشاف ہوا کہ الیاس کی کہانیوں میں انسانی تاریخ کے ضمیر کی حقیقی اور سچی گونج کا بڑا سبب کیا ہے! ظاہر ہے اُس نے پہلے ہر طرح کی تاریخ (خواہ وہ مطلق العنان بادشاہوں کے جبر اور دباؤ میں لکھی گئی ہو خواہ آزاد پناہ گاہوں میں۔ خواہ وہ حملہ آوروں کی یلغار میں زبردستی لکھوائی گئی ہو خواہ اُن سے بچ کر محفوظ تہہ خانوں میں لکھی گئی ہو) کا مطالعہ محقق کی نظر سے کیا۔ اسی طرح فلسفۂ تاریخ سے متعلق کتابیں (خواہ وہ مشرق کی تمدنی عظمتوں کی توثیق کے لئے تصنیف کی گئی ہوں خواہ مغربی تہذیبی معیارات کا سکّہ بٹھانے اور مشرق کو جھٹلانے اور کم تر ثابت کرنے کے لئے تحریر کی گئی ہوں) بھی اُس کے مطالعہ میں آئیں۔ اِس عمل میں اُس نے تاریخ کے ضمیر کی پرکھ کی اور اُن تمام عناصر کو 'فِلٹر' کر کے نکال لیا، جنھیں صدیوں سے چھپایا جاتا رہا ہے۔ مثلاً تاریخ کے باطن میں موجود نیکی، خوبصورتی اور سچائی کے بہت سے کرداروں کو جبر کے بے شمار خفیہ طریقوں سے دبایا گیا اور انھیں پُراسرار گمنامیوں میں دھکیل دیا گیا۔ دراصل بادشاہ، حاکم سردار اور اس قبیل کے بُتوں کی خودساختہ تمکنت اور شان و شوکت کے بارے میں ہی لوگ جانتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اُن کے ظاہری جبر کی اُن مثالوں کو، جن سے اُن کا بڑکپن ظاہر ہوتا ہو۔ الیاس نے ظاہریت کی بالکل پروا نہیں کی بلکہ نہایت بے خوف ہو کر اُس نے یہ دکھایا کہ بادشاہ، حاکم اور سردار وغیرہ بڑے کمینے اور ذلیل تھے۔ اُتنے ہی کمینے اور ذلیل جتنے عام آدمیوں میں چور، اُچکے، ٹھگ، بدمعاش اور قاتل ہوتے ہیں بلکہ اُن بس ڈرائیوروں کی طرح جو بے حسی سے آدمیوں کو کچل دیتے ہیں اور ان کنڈکٹروں کی طرح، جو مسافروں سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ "لال کنور کا افسانہ" میں جہاندار شاہ اُتنا ہی گھٹیا اور احمق معلوم ہوتا ہے جتنا خود اُس کی محبوبہ لال کنور۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی، ڈبوا دینے کے ہولناک عمل میں ایذارسانی سے لذّت لینے والی نفسیاتی کمینگی جہاندار شاہ اور لال کنور میں ایک جیسی معلوم ہوتی ہے۔ جنسی کجی اور 'پرورژن' دونوں میں ہی ہے۔ اس افسانہ میں بعض جگہ الیاس نے علامتی پیرایہ میں کچھ ایسے اشارے کئے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لال کنور اور جہاندار شاہ ایک دوسرے سے '69' گیم کھیلتے رہے ہوں گے۔ اِس مکروہ اور غلیظ عادت سے مغلوب ہو کر بڑے ہولناک جرائم کئے جاتے ہیں۔ افسانہ میں "امربیل" کا اشارہ محض درخت کی غذا چوسنے اور پھیلنے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نفسیاتی بیماری کا پیش خیمہ بھی ہے، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ "لال کنور کا افسانہ" کے علاوہ کچھ اور کہانیوں میں الیاس نے مغل بادشاہوں کی حرم سراؤں کا ذکر بڑی سفاک سچائی اور صاف گوئی سے کیا ہے: مثلاً ان حرم سراؤں میں مغل شہزادیوں کا یہ حال تھا کہ اُن کی شادیاں نہیں کی جاتی تھیں، انھیں کنوارا رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی مگر جنسی تشنگی سے مغلوب ہو کر شہزادیاں ناجائز تعلقات

اُستوار کر لیتی تھیں۔ با اثر درباری، منچلے سپاہی اور سپہ سالار ٹائپ کے افراد خواجہ سراؤں اور کنیزوں کو بھاری رشوت دے کر شہزادیوں سے ملوث ہوتے تھے۔ حرم سرائیں گویا تھیں، بالکل چکلا، مگر ایسا چکلا جو مغل بادشاہوں کی در پردہ مرضی اور اُن کے خاص ملازمین کی شاندار نگرانی میں چلتا تھا۔ مغل بادشاہ، خاص درباریوں کو ملائے رکھنے، فوج لڑانے اور فتح میں مدد دینے والے سپہ سالاروں کو خوش رکھنے اور بے جگری سے لڑنے والے سپاہیوں کو جاں نثار بنانے کے لئے کچھ اس طرح کی رعایتیں دیتے تھے۔ لیعنی دوسرے معنی میں یہ بادشاہ اُونچے درجہ کے دلال ہوتے تھے جیسے آج کے زمانہ میں پارلیمنٹری برد کر ہوتے ہیں۔ مگر مغل بادشاہ اپنا دبدبہ رکھنے کے لئے کبھی کبھار حرم سراؤں کی حدود میں بھُولے کر آنے والے معصوم آدمیوں کو ہولناک سزائیں دے کر ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ پھر بھی یہ سب کچھ کرنے والے مغل بادشاہوں کو مقدر کے ہاتھوں بے بس ہونا پڑتا، بالکل عام آدمی کی طرح۔ الیاس نے اپنی ایک کہانی "گھنگھروؤں کے زخم" میں نوجوان اعظم اور شہنشاہ اکبر کی ابتلا میں ایک مشترک قدر دریافت کی ہے۔ ضرورت مندی کی کمتری اور ظاہری برتری کے درمیان کے سارے فرق اُس وقت مٹ جاتے ہیں۔ جب شہنشاہ اکبر اپنی اتھاہ تمناؤں کے باوجود اپنے بیٹے شیخو (جہانگیر) سے نہیں مل پاتا اور اپنی حسرتوں کے ساتھ عبرت ناک موت مر جاتا ہے۔ مغل بادشاہوں کے علاوہ انسانی تاریخ کے مختلف دور کے فرماں رواؤں یہاں تک کہ دوسروں کے علاقوں پر حملہ کر کے قابض ہونے والے جابر قبیلوں کے سرداروں کی تاریخ سے الیاس نے بنیادی آدمی کی اتھاہ بدیوں کو بھی دریافت کیا ہے اور اتھاہ نیکیوں کو بھی۔ جہاں بدی اپنی اصل اور مستقل صورت میں آتی ہے، وہاں جہانگیر کی امرد پرستی اور اس کے لئے رقیب اور امرد لڑکے کی بہ یک وقت کھال کھنچوانے سے لے کر تاتار سردار قطلوغا کے مفتوح لوگوں کو ایذا دے دے کر ہلاک کرنے اور حور کے باپ کو خود اُسی کا گوشت کاٹ کر جبراً کھلانے جیسے مظالم ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں لال کنور اپنے کمینے بھائی کی خواہشات پوری کرنے کے لئے تاجر کی لڑکی کو زبردستی محبوس کرنے اور اپنی مرضی کی تابع بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ جہاں سکندر اعظم کی ماں اپنے محل میں اس قدر با اختیار ہے کہ اپنی نگرانی اور دیکھ ریکھ میں محل کی خوبصورت کنیزوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کے با اصول لڑکے کو اعصابی سکون بہم پہنچانے کے لئے شہوت دلائیں اور اُسے جنسی فعل پر آمادہ کریں بلکہ وہ چھپ کر دیکھتی ہے کہ کنیزیں کس کس طرح اُس کے لڑکے کو ملوث کرنے کی کوششیں کرتی ہیں اور جس کنیز کو خود سکندر اپنے پاس سے پرے ہٹا دیتا ہے کہ وہ مجسمہ ساز کی محبوبہ ہے تو اسے ملکہ اذیت دیتی ہے۔ غور کیجئے تو لال کنور اور سکندر کی ماں ملکہ اولمپیاس میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ دونوں کٹنیاں ہیں، دونوں اپنی اپنی جگہ مجسم بدی ہیں اور کچھ مجسم نیکی کی مثالیں بھی ہیں۔ سکندر محل کی خاص کنیز کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا بلکہ اُسے چاہنے والے مجسمہ ساز کو اپنی طرف سے خاص رعایت دیتا ہے

یہاں تک کہ ایران پر فتح حاصل کرنے کے بعد مجسمہ ساز کو ایرانی محبوبہ سے ملاقات کرانے اور اس ضمن میں ہر ممکن مدد کرنے کا جذبہ بھی اس میں بے انتہا ہے۔ اُسے اپنے وعدہ کا پاس ہے۔ اِس پر وہ عمل بھی کرتا ہے۔ اسی طرح نیکی کو عملی رُوپ دینے میں سچویشن کے فرق کے باوجود کچھ مماثلتیں بھی ہیں۔ ربوجیجی نائکہ اعظم کے لئے ایثار کرتی ہے۔ "خوابِ خرگوش" میں بیبرس، جو رکوتا تاریوں کے چنگل سے نکال کر آخر میں اُسے بیٹی بنالیتا ہے اور اصُول کے نلطے اُسے اس کے عیسائی عاشق ریمنڈ کے پاس لے جاتا ہے تاکہ مشرف بہ اسلام کی شرط کے تحت ریمنڈ اُسے اپنالے۔ "بُزدِل کا قصّہٴ عبرت"، میں سہیل کا چچا، سہیل کو بہادر بنانے کے لئے کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ خود کو دشمن کا تاثر دے کر ایک بُزدل کو ہمت ور بنانے میں وہ اپنے اوپر غلط الزام برداشت کرتا ہے یہاں تک کہ بھتیجا ہمت ور ہوتے ہی چچا کو ہلاک کر دیتا ہے۔ انتہا یہ کہ چچا کی بیٹی جو بچپن سے ہی سہیل سے منسوب تھی، اُس نے بھی اُسے بہادر بنانے کی مہم میں باپ کا ساتھ دیا۔ اس ایثار میں باپ کی ہلاکت کا صدمہ اُسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دراصل شروع سے اعلیٰ انسانی تہذیب کا آئیڈیل یہ رہا ہے کہ ایثار اور اس سے ملتی جلتی نیکی کے عوض کوئی صلہ نہیں ملتا۔ ایک بے لوث عمل کا بے لوث نتیجہ خود اُس کا ازلی و ابدی مقدّر ہے مثلاً ٹیلاوتی کی سرگزشتِ وفا"، میں لیلاوتی کو چاہنے والا اُس کے لئے قربانی کی جرأتوں سے گزر جاتا ہے مگر پھر بھی اُسے محروم ہونا پڑتا ہے۔ یہی محرومی لیلاوتی کے حصّہ میں بھی آتی ہے — بے لوث محبتوں کی داستانوں میں جو قدریں مخصوص ہیں، الیاس اُنھیں اپنی کہانیوں میں داستانی سواد کے ساتھ برتتا ہے۔ بادشاہ، سردار اور پروہت عام طور پر ظالم اور بدکار تھے مگر اُن کے عہد میں ایثار اور قربانی کے آئیڈیل بھی تھے۔ ظاہر ہے اگر یہ آئیڈیل نہ ہوتے تو بااختیار ظلم اور بدکاری سے مقابلہ کرنے کا کوئی جواز بھی نہ ہوتا۔ یہ درست ہے کہ آج کے زمانہ میں بھی معاشرتی مزاج کی تبدیلیوں کے باوجود قدیم ظلم اور بدکاریوں کو دہرانے والی حکومتیں اور اُن کے حاکم ہیں۔ جمہوریت کے پردہ میں بھی ڈکٹیٹر شپ کی بدترین مثالیں روز دُہرائی جاتی ہیں۔ چنگیز خاں نہ سہی مگر چنگیز خاں کا مدفن ہمارے لاشعور میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ بہت کچھ بدل چکا ہے مگر بہت کچھ نہیں بدلا ہے۔ اسی ایک اہم پوائنٹ سے الیاس اپنی کہانیوں میں اپنے مقصد کا تعین کرتا ہے۔

الیاس سیتاپوری کے مقصد کا ماخذ ہے اسلام اور صرف اسلام — اور اسلام سے مراد وہ اسلام جو حضرت آدمؑ کے خمیر سے شروع ہو کر حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ سے آں حضرتؐ کی ذاتِ اقدس میں، مل کر مکمل ہوا۔ آں حضرتؐ نے کعبہ میں رکھے ہوئے جن ۳۶۰ بُتوں کو توڑا تھا وہ دراصل بادشاہوں اور مختلف قبیلوں کے سرداروں کے بااختیار، خودساختہ مرتبہ کو ظاہر کرنے والے بُت تھے۔ علامتی معنوں میں اُن کی موجودگی کا لاشعوری طور پر سکہ بٹھانے کے لئے من گھڑت صنمیات اور دیومالاؤں کو رواج دیا گیا تاکہ لاریب قادر مطلق اور

قادرِ مطلق سے ہٹ کر جھوٹے دیوی دیوتاؤں کی صورت میں بادشاہوں اور سرداروں کو پوجیں ۔ آں حضرتؐ نے بُت شکنی کا اقدام اس لئے کیا کہ لوگ ازلی و ابدی سچ میں ایمان لائیں۔ بُت شکنی کے منصب کا اعادہ مختلف پیرایوں اور مختلف ادوار میں ہوا۔ ابنِ عربی کی معرفت وحدتِ وجود اور ابنِ خلدون کے توسط سے حق گوئی کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا اعادہ ہوا۔ یہی مسلک اُن تمام صوفیائے کرام کا رہا، جنھوں نے اپنی تعلیمات میں قربِ الٰہی کی وسعتوں کو عام کیا اور ہر دور میں مطلق العنان بادشاہوں سے اخلاقی سطح پر جنگ کی اور خلقِ خدا کو اُن کے عتاب سے بچائے رکھنے کی کوشش کی۔ یہی اخلاقی جنگ عوام النّاس سے مرکب محسوسات کے ساتھ مشرقی داستانوں میں منتقل ہوئی اور عام ہوئی۔ پریم چند تک پہنچ کر اس کی صورت عام ہندوستانی معاشرہ کی اُونچ نیچ کے شعور میں ڈھل گئی۔ پریم چند ذات پات کے مخالف تھے۔ یاد رہے کہ ذات پات کی تقسیم بھی بُت پرستی کی دین تھی اور مشرق میں اس کے خلاف جو اخلاقی جنگ لڑی گئی، اُس میں اسلام کا دخل اس لئے زیادہ ہے کہ اسلام نے انسانی آزادی کے تصوّر کی توسیع میں، مساوی حقوق، اخوت، انصاف اور سزا و جزا کے معیارات متعین کئے۔ اس کے برعکس مغرب میں انسانی آزادی کا تصوّر روحانی نظام سے نجات کے معنی میں بیسویں صدی پر مسلّط ہوا۔ اور جو کچھ روحانی نظام مغرب میں کبھی تھا وہ "اعترافات" کے ڈھونگ کے نتیجہ میں ختم ہو گیا۔ البتہ 'اعترافات' کے غلبہ سے جو فطرت مرتب ہوئی تھی وہ مغرب کے فکشن میں منتقل ہوئی۔ پریم چند کی خوبی یہ تھی کہ اُنھوں نے مغرب کے فکشن کی اعترافات والی ذہنیت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس "مشرقیت" پر اکتفا کیا جو عام ہندوستانی معاشرہ میں مرکّب اعتقادات کی صورت میں موجود تھی۔ یہی "مشرقیت" خالص اسلامی معنوں میں پریم چند کے بعد الیاس سیتاپوری کے مزاج میں اس انداز سے داخل ہوئی ہے کہ اُس نے مغربی اثرات قبول کئے بغیر براہِ راست ابنِ خلدون کے مسلک کو اختیار کیا۔

تاریخ ابنِ خلدون حصہ اوّل کے پیشِ لفظ میں علامہ عبد القدوس ہاشمی لکھتے ہیں:

"چونکہ تاریخ ہی کے ذریعہ ہمیں سنّۃ اللہ فی الارض سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور یہ واقفیت ہمارے افکار و اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے خدائے بزرگ و برتر نے اپنی مقدس کتاب قرآن حکیم میں لوگوں کو تاریخی واقعات کی طرف بار بار متوجہ کیا ہے اور بار بار تاکید فرمائی کہ حق کی تکذیب کرنے والوں کا کیا حال ہوا اور حق کو قبول کرنے والوں کو کیسی کیسی سربلندیاں نصیب ہوئیں، اِن کو سمجھو۔"

خود ابنِ خلدون نے اپنے بارے میں اپنی کتاب سے متعلق مقدمہ میں لکھا ہے۔

"میں نے تمام دُنیا کے بکھیڑوں سے الگ ہو کر اس کتاب کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع کیا اور جس نئے اسلوب سے میں نے اس مقدمے کو تکمیل تک پہنچایا وہ اس گوشہ نشین زندگی کی یادگار ہے۔"

اس بیان کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ جو بھی ابنِ خلدون کے مسلک کو اختیار کرے گا اُس کے رویّہ

اور مزاج میں حق گوئی کی صلاحیتیں اور جرأتیں بے پناہ ہوں گی۔ الیاس سیتاپوری نے جانے کب سے یہ مسلک اختیار کیا مگر جہاں تک میرے علم میں ہے کہ اُس کی زندگی میں ذاتی نوعیت کے جتنے بھی حادثات پیش آئے ہیں وہ محض حق گوئی کی پاداش میں۔ جو لوگ الیاس کی زندگی کے بارے میں نہیں جانتے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً وہ کسی ذاتی کامپلیکس کی بناء پر بادشاہوں، سرداروں، اور حاکموں کے خلاف اپنی کہانیوں میں توہین آمیز فضا بناتا ہے۔ ایسی ہی لاعلمی کے سبب اس کی ایک کہانی "گریۂ پیہم" کے خلاف حال ہی میں ایک افسوسناک کارروائی کی گئی کہ یہ کہانی جس شمارہ میں شائع ہوئی تھی، اُسے ضبط کر لیا گیا۔ ایک مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب کے نقاد یا تو اکثر جاہل ہیں یا جو معقول سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ الیاس سیتاپوری کی کہانیوں کا ذکر ادبی تنقیدی تعصب کی بناء پر نہیں کرتے اور یہ تعصب صرف اس سبب سے ہے کہ الیاس کی کہانیاں ادبی لیبل لگانے والے رسائل میں شائع نہیں ہوتیں بلکہ کمرشیل سطح پر چھپنے والے ڈائجسٹ میں شائع ہوتی ہیں حالانکہ الیاس خود اپنی کہانیاں کسی ادبی رسالہ میں اس لئے نہیں دیتا کہ معاوضہ نہیں ملتا۔ ظاہر ہے ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہے۔ یوں میں نے اس سے قطع نظر الیاس کی کہانیوں پر لکھنے کا فیصلہ خود کیا۔ الیاس نے مجھ سے خود پر کچھ لکھنے کے لئے نہیں کہا جیسا کہ یہاں بہت سے لکھنے والے ایک دوسرے سے فرمائش کرکے خود پر مضامین لکھواتے ہیں میں نے الیاس کی کہانیوں پر اس لئے لکھنے کا فیصلہ کیا کہ یہ میری ادبی دیانت کا تقاضا ہے۔ اگر متعصب نقاد الیاس سے غافل ہیں تو ہوا کریں مجھے تو بس اتنا کہنا ہے کہ میں نے الیاس کے منصب کو ذہن میں رکھتے ہوئے خود بھی حق گوئی سے کام لیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سوڈو انٹیلکچوئل نے الیاس کی کہانیوں کے موضوعات کے بارے میں بنا سوچے سمجھے رائے دی کہ یہ موضوعات تو آؤٹ آف ڈیٹ ہیں اور یہ تصور کہ ایسی کہانی لکھنا کہ اُس سے قاری کے جذبات کا تھارسس ہو۔ وہ عبرت بھی پکڑے اور اس کی روح بھی پرسکون ہو جائے۔ یہ تو انتہائی آؤٹ آف ڈیٹ ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ زمین پر جو ازل سے آسمان پھیلا ہوا ہے، زمین پر جو ندیاں نہ جانے کب سے بہتی چلی آ رہی ہیں۔ جانے کب سے سمندر موجود ہیں اور جانے کب سے آدمی کے آنسو زندگی کی المناکیوں پر بہتے آ رہے ہیں۔ خود آدمی جو نہ جانے کب سے اس زمین پر رہتا چلا آ رہا ہے۔ نہ جانے کب سے مظلوم حوریں، کسی نہ کسی ہیرو کا انتظار کرتی آ رہی ہیں۔ ان سب کو بھلا آؤٹ آف ڈیٹ کون کہہ سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ خود آؤٹ آف ڈیٹ ہو۔ مگر الیاس سیتاپوری دنیا کے تمام بکھیڑوں سے الگ ہو کر کہانیاں لکھتا ہے۔ لکھ رہا ہے اور اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک لکھتا رہے گا۔

یہ تو آپ کا یعنی پڑھنے والوں کا کام ہے کہ وہ الیاس کی کہانیوں کو یہ مان کر پڑھیں کہ وہ خالص مشرقی فکشن پڑھ رہے ہیں ایک ایسا فکشن، جس پر لکھنے والے کی پوری زندگی مبتلا ہے یہاں پہنچ کر میں اُن بددیانت نقادوں پر خاص طور پر منکشف کرنا چاہتا ہوں کہ الیاس سیتاپوری نے پریم چند کے بعد ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ کے گیپ کے بعد وہ کمی پوری کر دی ہے جو خالص مشرقی فکشن کا حسنِ امتیاز ہے ۔۔۔

احمد ہمیش
۔ فروری ۱۹۷۶ء

گھنگھروؤں کا زخم

سردی کا موسم تھا۔ شام قریب تھی، رات کھلے آسمان کے نیچے نہیں گزاری جا سکتی تھی، کہر نے ابھی سے فضا دھواں دھواں کر رکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرائے کے سامنے کا میدان بھی گھر گیا، دو رنگ خیمے ہی خیمے نظر آنے لگے اور سرائے میں یہ عالم تھا کہ لوگ سرائے کی کوٹھڑیوں کی حصولیابی کی کوشش میں ایک دوسرے پر چڑھے جا رہے تھے، کوٹھڑیاں کم تھیں اور مسافر زیادہ۔ کئی گھنٹے
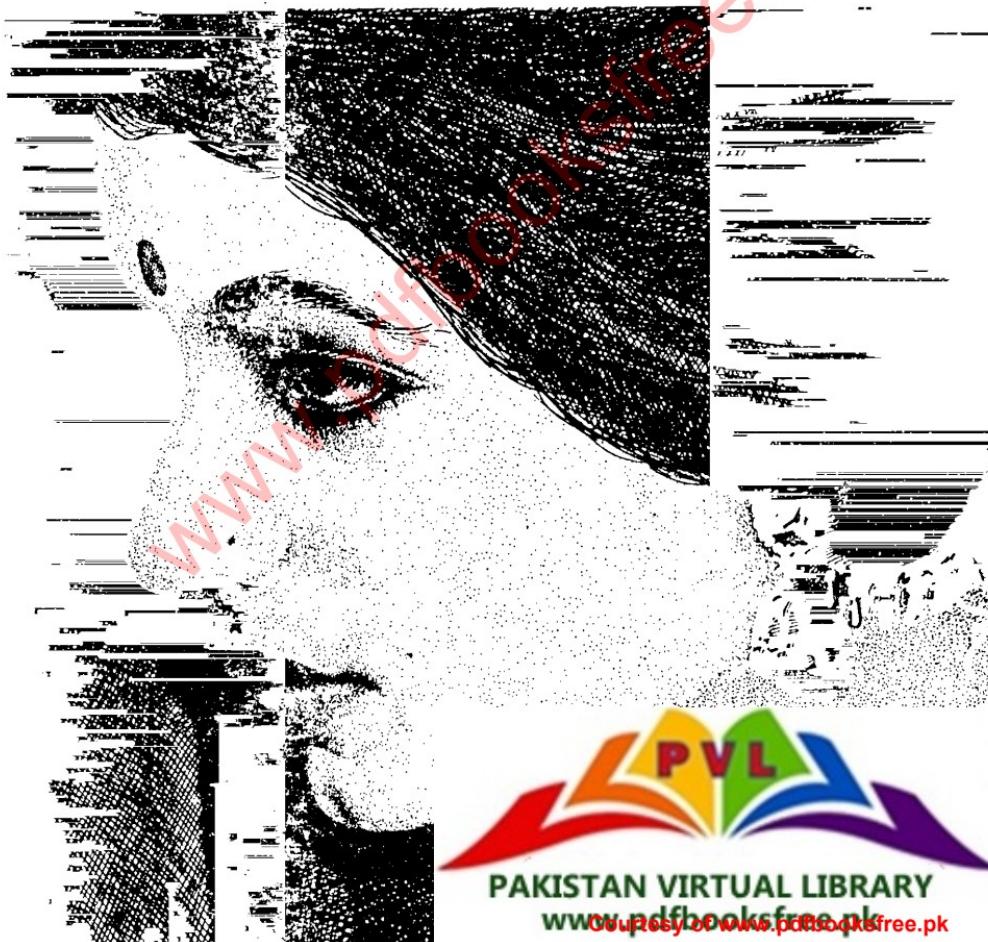
کی کوشش اور کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کر کچھ لوگ کوٹھریوں سے محروم رہ گئے اور کوٹھریوں کے کرائے داروں سے معاملہ کرنا پڑا۔ جب سب لوگ سرائے کی کوٹھریوں اور میدان میں لگے ہوئے خیموں میں سما گئے تو سرائے کے منشی مہاشے چندو لال جی نے دیکھا کہ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان گھنیری پکریا کے نیچے دری بچھائے نیم دراز ہے اس کی حالت شکستہ ہے۔ سرھانے ایک چھوٹا سا صندوق رکھا ہے اور پیروں پر پھٹا پرانا کمبل پڑا ہے، داڑھی بڑھی ہوئی ہے، کرتا داہنے شانے پر اس طرح پھٹا ہوا ہے جیسے کہیں کھونچ لگ گئی ہو، ذرا سی دیر میں یہ خبر قریب و دور پھیل گئی کہ ایک نادار شخص اس سردی اور کہر کے موسم میں پکریا کی گھنی چھاؤں میں بستر لگائے پڑا ہے، آہستہ آہستہ اس شخص کے آس پاس لوگ اس طرح جمع ہو گئے جیسے کرتب دکھانے ہوئے نٹوں کے گرد تماشائی جمع ہو جاتے ہیں۔

ایک بزرگ نے قریب آکر دریافت کیا "جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کہاں جانا ہے؟"

اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ شرم سے نظریں جھک گئیں اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

انہی بزرگ نے شفقت سے دریافت کیا "کیا اس کڑاکے کی سردی میں صرف اس پھٹے پرانے کمبل اور دری میں تم رات گزارنے کی ہمت رکھتے ہو؟"

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے کمبل پیروں سے کھینچ کر منہ پر ڈال لیا اور لیٹ گیا۔

کسی نے فقرہ کسا "یہ اصلی سلاجیت کا اثر ہے"

کسی دوسرے کا قہقہہ بلند ہوا اور آواز آئی "سلاجیت نہیں، کُشتے کھائے ہیں کُشتے، بھلا ان پر سردی کیا اثر کرے گی!"

لوگوں کو کہنیوں اور ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے سرائے کے منشی مہاشے چنڈو لال جی آگے بڑھے اور بے دردی سے کمبل کھینچ کر پائینتی ڈال دیا اور بڑبڑانے لگے "میاں جی! تمہارا کیا حال ہے، تم تو صبح تک اکڑا اکڑا کر سورگ سدھار جاؤ گے، کوتوال صاحب ہمیں پکڑیں گے، تم یہ اٹوائی کھٹوائی لے کر یہاں کیوں پڑے ہو آخر؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اس کی آنکھیں بہت زیادہ بھیگ چکی تھیں، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "لوگو! کچھ تو شرم کرو خدا سے ڈرو، میں تم سے کچھ مانگتا نہیں، جس حال میں جیسا پڑا ہوں، پڑا رہنے دو۔ غریب کی آہ سے ڈرو، مجھ سے دور ہو جاؤ"

لوگوں کی بھنبھناتی ہوئی آوازیں ایک دم کم ہو گئیں لیکن مہاشے چندو لال جی برس پڑے "بھائی میرے! ایسی غریب کی آہ سے زیادہ شہر کوتوال سے ڈرتا ہوں تمہیں اگر مرنا ہی ہے تو سامنے دریائے چنبل بہہ رہا ہے اس میں جا کر ڈوب مرو اگر ہماری سرائے کے سامنے جان دو گے تو کوتوال کے آدمی ہماری

جان بھی لے لیں گے!"

اتنے میں لوگوں کی توجہ کسی اور سمت ہو گئی۔ لوگ مڑ مڑ کر سرائے کے صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھر سے ایک ادھیڑ عمر عورت دو نہایت خوبصورت نوجوان لڑکیوں کے ساتھ چلی آ رہی تھی، ان کے بدنوں پر سرخ عنابی اور سیاہ شال لپٹے ہوئے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ لوگوں کی تمام حسوں میں سے صرف بصری حس کام کر رہی تھی، وہ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں، اور ان کی آمد سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سرائے کی شہزادیاں آ رہی ہوں۔ سب انہیں آتا دیکھ کر سنبھل گئے۔

مہاشے چندو لال جی انہیں دیکھتے ہی آگے بڑھے اور ادھیڑ عمر عورت سے کہنے لگے "رتو جیجی تمہی کچھ اپائے کرو، یہ شخص تو اپنی جان دینے پر تلا ہوا ہے، کچھ پوچھو تو بتاتا نہیں، ایسا لگتا ہے جیسے یہ یہیں ٹھٹھر ٹھٹھر کر جان دے دے گا اور ہم سب کو پھنسا دے گا۔"

رتو جیجی دونوں نوجوان حسین لڑکیوں کے ساتھ آگے بڑھیں تو مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ لوگ انہیں حرص و ہوس کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

رتو جیجی نے ایک نظر نوجوان پر ڈالی اور گویا ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ لیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں اور مہاشے چندو لال جی سے بولیں "منشی جی یہ بھیڑ ہٹاؤ اور انہیں ان کے سامان سمیت سرائے لے چلو، وہیں باتیں ہوں گی۔"

منشی جی نے زر خرید غلام کی طرح حکم کی تعمیل کی، دری کمبل خود سنبھالا، صندوق اس شخص نے اٹھایا۔ آگے آگے یہ لوگ چلے اور ان کے پیچھے پیچھے مجمع تھا جو رسوائی کی طرح ساتھ لگا ہوا تھا۔

سرائے میں داخل ہونے کے بعد رتو جیجی اس شخص کو سامان سمیت ایک کمرے میں لے گئیں یہاں کے ساز و سامان سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا کہ یہ کمرہ کسی رقاصہ کا ہے۔ الگنی پر بیش قیمت زنانہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ کونے میں بڑے بڑے کئی صندوق رکھے ہوئے تھے، جنہیں ایک موٹی آہنی زنجیر کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ کھونٹیوں پر گھنگھروؤں کی جوڑیاں لٹک رہی تھیں، طنبورے، رباب، پکھاوج اور جھنجھری ہر چیز موجود تھی۔

اندر داخل ہونے کے بعد رتو نے منشی جی کو حکم دیا "منشی جی! باہر لوگوں سے کہو اپنی اپنی کوٹھریوں میں جا کر آرام کریں، بھیڑ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

منشی جی نے اس شخص کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "اچھا جی جو حکم ہو اور ان مہاشے کے لئے کیا حکم ہے؟"

عورت نے ایک ادا سے گردن جھٹکی اور کہا "بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے ان سے باتیں تو کر لوں، تم جاؤ منشی جی، کیوں کھڑے ہو؟"

رنگ تو کسی زمانے میں بہت حسین ہوگی، اب بھی کچھ کم حسین نہیں تھی، اس کی گفتگو میں وقار بھی تھا اور مٹھاس بھی۔

جب منشی جی مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے تو اس نے ایک مونڈھے کی طرف اشارہ کر کے کہا "بیٹھ جاؤ"۔ وہ کسی جھجک کے بغیر بیٹھ گیا اور دونوں لڑکیاں بھی اجازت کے بغیر ہی دوسرے مونڈھوں پر بیٹھ گئیں، عورت اپنی مسہری پر تقریباً دراز ہوگئی۔ اس نے اپنی کہنی مسہری پر ٹکالی اور سر ہتھیلی اور انگلیوں پر رکھ لیا اور محویت اور انہماک سے اس شخص کا جائزہ لینے لگی، پھر دریافت کیا "ہاں اب بتاؤ کہ بات کیا ہے؟ تم باہر پکریا کے نیچے ڈیرا ڈالے کیوں پڑے تھے؟"

یہ کہتے کہتے عورت کی نظر بیٹھے ہوئے کرتے سے پھسل کر نیچے پیروں تک چلی گئی۔

اس نے نظریں جھکالیں اور آہستہ سے بولا "کیا میری حالت آپ کو کچھ نہیں بتا رہی؟"

"بتا کیوں نہیں رہی لیکن ہم تمہاری ہی زبان سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔"

اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں، کہنے لگا "معزز خاتون، مجھے نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں لیکن آپ کی باتوں میں ہمدردی اور انسانیت کی حلاوت ضرور موجود ہے، آپ میری بابت کچھ جاننا چاہتی ہیں تو عرض کرتا ہوں، پھر وہ کچھ ٹھیر کر کہنے لگا: میرا نام اعظم ہے، دھولپور کے نواح میں چیت پور کا تعلقہ کبھی اپنا تھا۔ لیکن اب اس پر بڑے بھائی نے قبضہ جما لیا ہے اور کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ اگر میں اس بے سر سامانی میں نکل نہ کھڑا ہوتا تو یقیناً قتل کر دیا جاتا۔ جب چیت پور سے چلا تھا تو میری ہمیانی سے پچاس اشرفیاں راستے میں معلوم نہیں کہاں گر گئیں۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ آگرے میں قسمت آزمانے جا رہا ہوں وہاں معاش کا کوئی حل نکالوں گا، اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ سرائے کی ایک کوٹھڑی کرائے پر لے سکوں اور غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی کا سہارا لوں یا کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، اس لئے پکریا کے نیچے پڑا رہا تھا۔ جہاں لوگوں نے میری مفلسی کا خوب اچھی طرح مذاق اڑایا، میں نے اتنے برے دن کبھی نہیں دیکھے تھے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

عورت اٹھ کر بیٹھ گئی "بس اتنی سی بات پر اس قدر دل برداشتہ ہو رہے ہو؟ خوب!" اس کے بعد اس نے ایک خوبصورت لڑکی سے کہا "تمی وہ چھوٹا والا صندوق تو کھولنا"۔ اور پھر اعظم سے مخاطب ہوئی "مجھے رابعہ کہتے ہیں، عرفیت ربّو ہے، پیشے کی بابت کچھ بتانا غالباً فضول ہے۔ اس کمرے کا ساز و سامان اور رکھ رکھاؤ ہی تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوگا۔ تم ایک نوجوان ہو، مجھے تم پر تو نہیں البتہ تمہارے

اس وقت بڑے پر بڑا ترس آیا۔ معلوم نہیں تم میری پیش کش قبول بھی کرو گے یا نہیں، بہرحال انسانی ناطے سے میں کچھ سلوک کرنا چاہتی ہوں۔ اگر اسے تحفہ سمجھ کر قبول کرنے میں کوئی عار ہو تو اپنا وقت اور حالات دیکھتے ہوئے اسے قرض سمجھ کر قبول کر لینا اور جب حالات سدھر جائیں تو یہ قرض اتار دینا۔ ہم لوگوں کے متعلق تم نے نہ جانے کیا کچھ سنا ہو گا۔ ہم اتنے بُرے نہیں ہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں۔"

اعظم خاموش رہا کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ ربّو اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔

ربّو مسہری سے اتر کر ممّی کی طرف چلدی جو صندوق کھولے بیٹھی تھی، ربّو اس میں سے پچاس اشرفیاں نکال لائی اور اعظم کی طرف بڑھا کر بولی "اعظم میاں! یہ حاضر ہیں، قبول کرو۔ ظاہر ہے کہ آگرے میں ملازمت تمہارا انتظار تو کر نہیں رہی ہے۔ کچھ دن اِدھر اُدھر دھکے بھی کھانے پڑیں گے۔ بیکاری کے دنوں میں یہ اشرفیاں تمہارے کام آئیں گی۔"

اعظم کو اشرفیاں قبول کرنے میں تامل تھا لیکن ربّو نے اشرفیاں اعظم کی گود میں ڈال دیں اور ناگواری سے بولی "ٹھیک ہے کہ یہ اشرفیاں حرام کی کمائی کی ہیں لیکن میں انہیں تمہاری نذر نہیں کر رہی ہوں بلکہ قرض کے طور پر دے رہی ہوں، یہ میں نے اپنے کفن دفن کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ دولت تو آنی جانی چھاؤں ہے میاں۔ آج اللہ کا دیا سب کچھ میرے پاس موجود ہے لیکن کل معلوم نہیں کیا حالات ہوں اس لئے موت و زندگی کے لئے یہ پچاس اشرفیاں الگ رکھ چھوڑی تھیں، فی الوقت تم یہ لے جاؤ اور جب حالات سدھر جائیں تو مجھے واپس کر دینا یا پھر جب میں مر جاؤں تو اطلاع پانے پر اس رقم سے میری تجہیز و تکفین کا انتظام کر دینا اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو انہیں خیرات کر دینا۔"

اعظم نے کنکھیوں سے ربّو کو دیکھا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود اس کے ناک نقشے میں ایک قسم کا تیکھا پن تھا اور بے پناہ کشش موجود تھی۔ اس نے اشرفیاں قبول کر لیں اور بولا "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

ربّو بولی "میں مہاشے چندولال جی کو بلا کر برابر کی کوٹھری تمہیں دلائے دیتی ہوں، تم جتنے دن چاہو یہاں رہو، کوئی تم سے اس کا کرایہ وصول نہیں کرے گا۔ یہ میرا گھر نہیں ہے، ہم لوگوں کا گھر کہاں ہوتا ہے مگر تم اسے گھر سمجھ سکتے ہو تو یہی سمجھ کر رہو۔"

یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ ربّو نے اسے حکم دیا "مہاشے چندولال جی کو بلاؤ۔"
منشی چندولال آئے تو ربّو نے ان سے کہا۔ "منشی جی یہ برابر والی کوٹھری میں نے انہیں دے دی ہے، کرائے اور ان کے کھانے پینے کی طرف سے کوئی فکر نہ کرنا۔ سارے مصارف میں خود برداشت کروں گی۔"
منشی جی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا فوراً اسے لے کر کوٹھری میں پہنچ گئے۔ یہاں سبھی کچھ موجود تھا۔

پلنگ، بستر، کمبل، پانی کا گھڑا، چار مونڈھے اور ایک مصلّا۔ اعظم ان چیزوں اور آسائشوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ مہاشے جی اس کی خوشی اور حیرت بھانپ گئے۔ فرمانے لگے "تعجب کیا کرتے ہو میاں جی! اپنی رتو بی بی کو تم کوئی معمولی عورت نہ سمجھو، یہاں سے آگرے تک بڑے بڑوں سے ان کی راہ و رسم ہے، گھڑی بھر میں آدمی کو ادھر سے ادھر کر دیتی ہیں۔ سرائے میں ٹھہرنے والوں کی تفریح اور دل بستگی کا کام انہی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد گرم گرم کھانا بھی آگیا۔ بھوک بڑی شدت کی تھی، جب وہ نوالے شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا تو معًا اس کا خیال اپنی محسنہ کے مکروہ اور ناجائز پیشے کی طرف گیا اور نوالے حلق میں اٹکنے لگے لیکن معدہ اپنا حق حاصل کرنا خوب جانتا تھا۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ کونے میں کھڑے ڈیوٹ پر سرسوں کا دیا کوٹھری میں ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی بکھیر رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اٹھا، وضو کیا، عشا کی نماز پڑھی اور پھر دو رکعت شکرانہ ادا کیا۔ لیکن ان اعمال و اذکار کے دوران اسے یہ خیال بری طرح ستا تا رہا کہ اس کی محسنہ نائکہ ہے اور اس کوٹھری میں اسے جو کچھ بھی میسر آیا ہے وہ حرام کی کمائی کا ثمرہ ہے، آہ وہ کیسے حالات سے دوچار ہو گیا ہے۔

رات سوتے سوتے کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور ہر بار کہیں قریب ہی سے گھنگروؤں کے کھنکنے، ساز دل کے بجنے، چڑھتے اترتے ترنم سروں میں ڈوبی ہوئی گانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، بے اختیار وہ اس طرف کھنچنے لگتا لیکن وہاں جانے کی صورت ہی نہ تھی۔ وہ رتو پر کوئی غلط تاثر قائم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

صبح رتو خود اس کے پاس پہنچ گئی۔ ان دونوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ اعظم نے اس کی مہربانیوں کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے، اعظم آگرے پہنچنے کے منصوبے بناتا اور توڑتا رہا۔ اسے عملی زندگی گزارنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا، اس لئے کسی بات کی ہمت نہ ہوتی تھی اور شرم بھی آتی تھی کہ اس طرح اب وہ کب تک یہاں پڑا رہے گا۔ کوٹھری میں پڑے پڑے اس کی طبیعت اکتا گئی تھی اور باہر اس لئے نہیں نکلتا تھا کہ لوگ کہیں اس پر انگلیاں نہ اٹھائیں، جو تماشائی اعظم کی خستہ حالی کا تماشا دیکھ چکے تھے، ان کا انگلیاں اٹھانا اور اسے طنز و تضحیک کا نشانہ بنانا یقینی تھا۔ سرائے کے تمام مسافر مختلف مشاغل میں مبتلا رہتے تھے، کوئی شطرنج سے دل بہلاتا، کوئی گنجفہ کھیلتا، کوئی سرائے کی پیشہ ور عورتوں کی صحبت میں رنگ رلیاں مناتا، کوئی صرف نغمہ و سرود میں مدہوش اور سرشار رہتا۔ بس اعظم ہی ایک ایسا شخص تھا جس کا کوئی مشغلہ نہیں تھا جس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ کوٹھری میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ البتہ کبھی کبھی رتو آتی اور کچھ دیر اس سے باتیں کر کے چلی جاتی تھی۔ اعظم کم گو اور رتو باتونی، رتو باتیں کرتی تو اعظم اس کے جواب میں زیادہ تر ہوں، ہاں، نہ نہیں کرتا رہتا اور رتو دل برداشتہ ہو کر چلی جاتی۔

ایک دن ربّو سہ پہر کو اچانک اس کی کوٹھری میں آ گئی، اس نے جوڑے میں سُرخ گلاب لگا رکھا تھا اور بالوں میں موتیوں کی لڑیاں پرو رکھی تھیں، بسنتی ساری اور بسنتی کرتی زیب تن تھی، چہرہ غازے سے آلودہ تھا کانوں میں ہلال کے نیچے جھلملاتا آویزے لٹکے ہوئے تھے، انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں تھیں، آنکھوں میں کاجل کی لکیریں، ہونٹوں پر مسکراہٹ، نظروں میں شرارت، وہ اس دھج سے سینہ تان کر اعظم کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ بے شک بڑی حسین عورت تھی۔

اعظم نے اسے ایک نظر دیکھا اور گھبراہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج ربّو کے انداز روز جیسے نہیں ہیں۔

ربّو نے ہنس کر ڈانٹا۔ "یہ تم چوبیس گھنٹے اس کوٹھری میں پڑے کیا کرتے رہتے ہو جی؟"

اعظم نے ندامت اور بوکھلاہٹ سے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں، لیٹے لیٹے طبیعت اکتا جاتی ہے تو اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور کچھ گنگنانے لگتا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

"خوب!" وہ کھلکھلائی۔ "تمہیں اپنا گھر بھی تو یاد آتا ہوگا؟"

"یاد کیوں نہیں آتا لیکن وہاں میری بوڑھی ماں کے سوا مجھ سے محبت کرنے والا ہے ہی کون!" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

پھر ربّو نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں گانا سننے کا بھی شوق ہے؟"

اعظم نے جھجکتے جھجکتے جواب دیا۔ "ہے تو مگر..."

"اور ناچ دیکھنے کا؟" ربّو نے اٹھلا کر پوچھا۔

اعظم نے شرما کر جواب دیا۔ "ہاں دیکھنے کو جی تو چاہتا ہے۔"

"تو پھر آج رات میرے ساتھ رہنا، میں تمہاری طبیعت خوش کر دوں گی، تم نے پہلے کیوں نہیں کہا تھا، میں بھی تو کہوں کہ یہ کیسا نوجوان ہے، خیر آج رات ساری کسر نکل جائے گی، خوب رنگ جمے گا۔" ربّو نے بڑی خاص ادا سے کہا۔

اعظم نے اداس ہو کر جواب دیا۔ "بس ایسی ہی بات ہے جس کی وجہ سے منہ چھپائے یہاں پڑا رہتا ہوں۔"

ربّو کو اعظم کے شرمگیں انداز پر ہنسی آ گئی۔ اس نے بے اختیار بڑھ کر اعظم کے داہنے رخسار پر ہلکی سی چپت رسید کر دی۔ بولی، "میں خوب سمجھتی ہوں کہ تم کیوں منہ چھپائے پڑے رہتے ہو۔"

اعظم نے سوالی نظروں سے اسے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں،

ربّو نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "ہاں جی تم یہی سوچتے ہو گے کہ کہاں ایک رنڈی اور کہاں ایک شریف زادہ۔ میں جو کچھ تمہارے ساتھ کر رہی ہوں، حرام کی کمائی سے کر رہی ہوں!"

بات سچ تھی اعظم کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی اور رتو کے لئے اس کے دل میں پہلی بار کچھ احساسات بیدار ہوئے۔ اعظم نے جھٹ بات بنائی "نہیں یہ بات نہیں ہے، آپ غلط سمجھیں!"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، بات یہی ہے اور یہ بات کم از کم تمہاری حد تک درست بھی ہے، شریف ماں باپ کے بیٹے ہو ایک اعلیٰ خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے تمہیں اسی طرح سوچنا چاہیئے لیکن سنتی ہوں کہ تم بدھ نے بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک دیشیا کا کھانا خوشی خوشی کھایا تھا اس کی یہیں تمہیں کتنی ہی مثالیں دے سکتی ہوں کہ بڑے بڑے بزرگ فاحشاؤں پر مہربان رہا کرتے تھے۔"

اعظم اب تک اسے ایک معمولی طوائف سمجھ رہا تھا لیکن اب تو وہ ایک لائق فائق شخصیت بھی معلوم ہونے لگی تھی، وہ نہ جانے کیا کیا جواب دیتی رہی، پھر اعظم نے تجالت مٹانے کے لئے کہا "بخدا میں آپ کے متعلق کوئی بری بات نہیں سوچتا میں تو اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتا ہوں، اگرے جاؤں گا۔ وہاں معلوم نہیں کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑیں، یہی سب سوچ سوچ کر پریشان ہوں اور میرا حوصلہ پست ہو گیا ہے۔"

رتو نے ایک بار پھر ہنسی کی پھلجھڑی چھوڑی "ایک جھوٹ نبھانے کے لئے ستر جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، خیر اگر تم میری مانو تو کچھ نصیحتیں گرہ میں باندھ لو۔ طوائف اور نصیحتیں دو متضاد چیزیں ہیں، لیکن یقین کرو تم میرے مشوروں پر چلے تو بڑی کامیاب زندگی گزارو گے، سمجھے کہ نہیں؟"

اعظم نے خفیف ہو کر کہا "آپ مجھ سے جو کچھ بھی کہیں گی میں مانوں گا۔"

رتو نے ساری کا آنچل دانتوں تلے داب لیا۔ اعظم نے ایسا محسوس کیا جیسے رتو چشم زدن میں ایک نوخیز اور نوعمر حسینہ ہو گئی ہے، اس کی یہ ادا قیامت کی تھی۔ اعظم مجروح ہو گیا۔

رتو کہنے لگی "میں جو کچھ کہوں گی اسے سن کر تم یہی کہو گے کہ رتو رنڈی ہے، آبرو باختہ ہے اس لئے اس قسم کی باتیں کر رہی ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ تم میری باتیں سن کر مجھے کیا کہو گے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ میری باتوں کی سچائی تمہیں اپنی زندگی میں قدم قدم پر نظر آتی رہے گی۔ میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔"

پھر رتو سنجیدگی سے کہنے لگی "اعظم! زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لئے عقل مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان خواہشوں کا غلام ہے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ خدا ایک ہے اور میں کہتی ہوں کہ ایک نہیں بلکہ دو ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اگر تم یہ کہو کہ اخلاقی اور معاشرتی اقدار بڑی چیزیں ہیں اور جسے ہمارے معاشرے نے کھوٹا کہہ دیا ہے وہ بدترین چیز ہے تو یہ بکواس ہے، میں اسے نہیں مانتی۔ میں سمجھتی ہوں محرومی بدترین گناہ ہے تم جب اگرے پہنچ گئے تو وہاں کی دنیا تمہارے لئے نرالی ہو گی، غور سے سنو، وہاں تم ہر طرح یہ کوشش کرنا کہ کسی طرح شہنشاہ اکبر اعظم کے وزیر با درایں کے دین الٰہی کے خلیفہ ابوالفضل سے تمہاری ملاقات ہو جائے اگر تم وہاں تک رسائی حاصل کر لو تو تم بے جھجک ہو کر اس سے یہ کہنا کہ میں دین الٰہی اختیار کرنا

چاہتا ہوں، مجھے شہنشاہ کے پیروؤں میں شامل کر لیا جائے۔ اعظم! میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو تم آگرے کے خوش قسمت لوگوں میں شمار کئے جانے لگو گے!"

اعظم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دین الٰہی اختیار کیا جائے؟ گویا اسلام ترک کر دیا جائے؟ اسے ربّو پر غصہ آ گیا۔ یہ چونکہ خود رنڈی ہے اور کمائی کے سلسلے میں جائز و ناجائز اور پاک و ناپاک کا کوئی تصوّر اس کے ذہن میں نہیں ہے اس لئے یہی تعلیم مجھے بھی دے رہی ہے۔ پھر اسی لمحے اعظم کے حافظے میں آنحضرتؐ کی ایک حدیث گونجنے لگی "زیادہ غربت اور زیادہ امارت انسان کو خدا سے منکر کر دیتی ہے۔"

ربّو نے اس کی تشویش اور کرب محسوس کر لیا۔ ہنستی ہوئی بولی "میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی جبر شامل نہیں ہے تم آزاد ہو مناسب سمجھو تو اس پر عمل کرو اور اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو گول کر جاؤ۔"

اعظم کو اس کی یہ فراخ دلی اور سادگی اچھی لگی، بولا "کچھ اور باتیں کیجئے سر دست یہ موضوع نظر انداز کر دیجئے۔"

ربّو نے کہا "رات کو ذرا جلدی تیار ہو جانا۔ کپڑے دوسرے پہن لینا۔ تمہیں ٹھاٹ باٹ میں دیکھوں، بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگا کر میرا انتظار کرنا، اگر آج تمہارے دل کی خشکی دور ہونے کا کچھ اہتمام ہو جائے تو کیسا رہے گا؟"

اعظم نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی اور پھر وہ دنگ رہ گیا، کیوں کہ ربّو نے ــــ باتیں کرتے کرتے اچانک اس کے گال پر ایک چپت رسید کی اور اس کے بالوں کی لٹیں انگلیوں میں لے کر پیشانی سے ہٹا دیں، اعظم کو حیا سی محسوس ہوئی۔ یہ ربّو تو بہت ہی بے شرم ہے اور پھر اس وقت تو بے شرمی کی انتہا ہو گئی، جب ربّو وارفتگی میں اخلاقی حدود سے ایک قدم اور آگے بڑھ گئی، اسے نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے چلتے چلاتے اعظم کو سینے سے لگا کر چٹاخ پٹاخ کئی بوسے لے لئے، ربّو کے بدن میں نہ معلوم کیا تھا جو اس کا انگ انگ سرشار کر گیا۔ اس نے آج تک کسی عورت کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ لرز لرز گیا۔ ربّو نے تو اس کے سارے جسم میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔

جب ربّو چلی گئی تو دیر تک ایک سرور آمیز کیفیت طاری رہی، ربّو کا مسکراتا ہوا چہرہ اور اس کے شرم و حیا سے عاری والہانہ طور طریق اسے دیر تک لطف اندوز اور بلکان کرتے رہے، اس کے جی میں آئی کہ وہ آگرے نہ جائے بلکہ یہیں ربّو کی حضوری میں زندگی گزار دے لیکن پھر یہ سوچ کر مغموم ہو گیا کہ ربّو کی حضوری میں زندگی گزارنے کا مفہوم حقیقتاً کتنا شرمناک ہے، لوگ اسے کیا کہیں گے؟ ربّو کا یار، اس کی عصمت فروشی کی دکان کا بیوپاری تاجر
اس کے جی میں آئی کہ اسی وقت یہ سرائے چھوڑ کر چپ چاپ آگرے روانہ ہو جائے اور چلتے وقت کسی طرح ربّو کی اشرفیاں بھی واپس کر دے، مگر یہ سوچ کر کہ وہ آگرے میں خالی ہاتھ کس طرح زندگی گزارے گا، اپنے اس جذباتی خیال پر عمل کرنے سے باز رہا۔

اس رات غضب کی سردی تھی، اعظم پوری طرح تیار ہو کر ربّو کا انتظار کر رہا تھا، جب ربّو بنی سنوری قیامت بنی پہنچی تو وہ کچھ کپکپا رہا تھا۔ ربّو نے اپنی شال اتار کر اس کے حوالے کر دی، اعظم کو قبول کرنے میں تامل ہوا۔ اس نے پوچھا "یہ اگر آپ مجھے دے دیں گی تو خود کیا اوڑھیں گی، آپ کو بھی تو سردی لگے گی۔"

ربّو نے شوخی سے کہا "میں تمہارا خیال دل میں لے آؤں گی۔" پھر کہنے لگی "خوب سبحان اللہ اب تک تو میں یہ سمجھ رہی تھی کہ میں تمہاری فکر کر رہی ہوں لیکن اب معلوم ہوا کہ تمہیں بھی میری فکر ہے، خدا خیر کرے۔"

وہ نقرئی قہقہے بکھیرنے لگی، اعظم نے جھینپ کر جواب دیا "میں غریب الوطن، بے آسرا اور بے یار و مددگار مسافر، میں بھلا آپ کی کیا فکر کر سکتا ہوں۔"

ربّو واپس جاتی ہوئی بولی "اس قدر معصومیت کا اظہار نہ کرو۔ میں ابھی آتی ہوں، تم چلنے کے لئے تیار رہنا ویسے بج رہے ہو جی۔"

وہ چلی گئی اور اعظم اس عجیب و غریب اور ہنگامہ خیز عورت کے بارے میں یہ سوچنے لگا کہ کیا کوئی رنڈی کسی مرد سے بے لوث محبت کر سکتی ہے؟ نہیں یہ ناممکن ہے، رنڈی اور بے لوث محبت! دو متضاد چیزیں ہیں۔

ربّو واپس آگئی اس نے ایک دوسری سرخ شال اوڑھ رکھی تھی۔ کوٹھری کے باہر گھوڑا گاڑی ان کی منتظر تھی، دونوں اس میں بیٹھ گئے اور گاڑی سرائے کے بڑے پھاٹک کی طرف روانہ ہو گئی۔

سرائے کے پھاٹک کے اوپر ایک بارہ دری تھی۔ اس بارہ دری کے آس پاس جو کمرے تھے ان میں اُمرا قیام کرتے تھے، یہاں کی شان و شوکت ہی کچھ اور تھی۔ بارہ دری کا ہال رقص و موسیقی کے کام آتا تھا۔ یہاں ٹھہرنے والے اُمرا سرائے کی پیشہ ور عورتوں سے ملنا نا معیوب سمجھتے تھے، ان کی خواہش اور حکم پر ناچنے گانے اور تفریح طبع کے اسباب مہیا کرنے والی عورتیں یہیں پہنچا دی جاتی تھیں۔ ربّو کی گھوڑا گاڑی بھی وہیں جا رہی تھی، راستے میں ربّو کہنے لگی "آج شاید تمہاری قسمت جاگ جائے۔"

اعظم نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

ربّو نے جواب دیا "ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں کچھ ایسے آدمیوں سے بھی ملاقات ہوگی جو آگرے جانے والے ہیں اور مغل دربار میں اثر و رسوخ کے حامل ہیں۔"

اعظم اس خبر سے بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے والا ایک سوال بغیر سوچے سمجھے اگل دیا۔

"ان سے میرا تعارف کس طرح اور کس حیثیت سے کرایا جائے گا؟"

ربّو اس کی اندرونی خلش بھانپ گئی، اس کے چہرے پر ایک رنگ ابھرا اور اس نے اپنے دل پر ضبط کی سِل رکھ کر جواب دیا "تعارف کس طرح ہوگا یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے، بس یہ یقین تمہارے لئے کافی

ہونا چاہئے کہ تمہاری عزت آبرو پر کوئی حرف نہیں آنے دیا جائے گا۔ تم ایک رنڈی کے ساتھ جا رہے ہو مگر وہ ایک عورت بھی ہے۔"

اعظم چپ ہو گیا۔ ربّو بھی کچھ سوچنے لگی۔

تھوڑی دیر میں ان کی گاڑی پھاٹک کے اندر پہنچ کر رک گئی، ربّو نیچے اتری اور اعظم کو لے کر کھٹ کھٹ اوپر چڑھنے لگی۔ اوپر کی بارہ دری کا عالم ہی کچھ اور تھا، اسے خوب اچھی طرح سجایا گیا تھا، جگہ جگہ گلدستے رکھ کر چمنستان کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، ان میں پام کے بڑے بڑے درخت والے گلدستے بھی موجود تھے، بارہ دری کے ہال میں لمبی چوڑی دریاں اور ان پر چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں، گاؤ تکئے بھی بڑے قرینے سے جگہ جگہ رکھے ہوئے تھے، بارہ دری کے کناروں پر چند میزیں پڑی تھیں جن پر ساغر و مینا کی برات لگی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ غم غلط کرنے میں مشغول تھے۔ جیسے ہی ربّو اور اعظم داخل ہوئے سب کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں، ربّو بڑی مستانہ چال سے تماشائیوں کے دل روندتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ نظروں ہی نظروں میں کسی کو تلاش کر رہی تھی لیکن لوگ اسے دیکھنے میں محو تھے۔ ایک دراز ریش بزرگ ذرا آگے بڑھے اور فرمانے لگے۔ "ارے رابعہ بیگم! تم کہاں تھیں؟ ہم دیر سے تمہارے منتظر ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے اعظم کو شبہے اور ناگواری سے دیکھا۔

ربّو نے فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور بولی "حضرت! بندی آپ ہی کو تلاش کر رہی تھی، جناب کب تک یہاں تشریف فرما رہیں گے؟"

پھر اعظم سے ان کا تعارف کرایا۔ "اعظم میاں! ان سے ملو، حضرت زین شاہ، ابوالفضل وزیر دولت مغلیہ ان کی بے حد عزت کرتا ہے۔"

زین شاہ نے کنکھیوں سے اعظم کو دیکھا اور ––– نظر انداز کر دیا پھر ربّو کو دیکھتے ہوئے فرمایا "جب ہم ادھر سے گزرتے ہیں تمہاری ذات ہمیں یہاں ٹھہرنے پر مجبور کر دیتی ہے، اب کے ہم کم از کم ایک ہفتے تو ضرور قیام کریں گے۔"

ربّو اور زیادہ بچھ گئی۔ بولی "حضرت! یہ نوجوان بہت پریشان ہے، اس کے عزیزوں نے اسے بہت ستایا ہے، یہ ان سے تنگ آ کر بے سروسامانی کی حالت میں گھر سے نکل پڑا، آگرے جا رہا تھا۔"

اس کے بعد ربّو نے اعظم کی پوری داستان شاہ صاحب کے گوش گزار کر دی، آخر میں بولی۔ "بندی کی درخواست ہے کہ حضرت اس کے حال پر کرم فرما کر اسے آگرے میں کسی خدمت پر لگوا دیں، عین بندہ پروری اور کنیز نوازی ہوگی، یہ بہت مستعد، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان ہے، آپ کی عنایتیں رہیں تو کچھ کر گزرے گا۔"

شاہ صاحب نے صدر گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، تم ان کی سفارش کرتی ہو تو ان کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ ہم نے تمہاری کوئی بات کبھی مسترد کی ہے؟"

حاضرین مجلس میں سے ہر شخص شاہ صاحب کو دیکھ کر آگے بڑھتا، مصافحہ کرتا، ہاتھ چومتا اور پھر اپنے ہاتھ سینے پر پھیر لیتا۔ شاہ صاحب حاضرین مجلس کو دست بوسی کی سعادت سے نوازتے ہوئے صدر نشین ہو گئے، ربّو بھی ان کے سامنے مؤدبانہ بیٹھ گئی اور ربّو کے برابر ذرا ہٹ کر اعظم بیٹھ گیا۔

شاہ صاحب نے ربّو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے حکم دیا "تمہاری جگہ وہ نہیں ہے، یہ ہے، یہاں آؤ تم میرے پہلو میں بیٹھو، رابعہ بیگم! ہم تمہیں اور تمہارا فن ہی تو دیکھنے آتے ہیں یہاں! تمہیں دیکھتے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے۔"

ربّو بصد انکسار شاہ صاحب کے بائیں طرف بیٹھ گئی۔

شاہ صاحب کی ہوشیار نگاہوں نے اعظم کی دلی کیفیت تاڑ لی۔

اعظم، شاہ صاحب کی شخصیت کو مشکوک محسوس کر رہا تھا۔ شاہ صاحب نے فوراً ارشاد فرمایا "رابعہ بیگم! اللہ جمیل یحب الجمال، اللہ چونکہ خود حسین ہے اس لئے جمال کو پسند فرماتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال اس عاجز کا ہے کہ جہاں حسن نظر آتا ہے وہاں دیوانہ وار کھنچا چلا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر قلبی طمانیت کا اظہار کیا۔

پھر اچانک شاہ صاحب اعظم سے مخاطب ہوئے "کیوں میاں صاحبزادے! تم کس فن میں طاق ہو؟ کس جگہ کے لئے موزوں ہو سکتے ہو؟"

اعظم نے جواب دیا "جناب والا مجھے نہیں معلوم کہ میں کس جگہ کے لئے موزوں رہوں گا۔ ویسے شعر و شاعری کا مجھے بے حد شوق رہا ہے۔"

ربّو نے بات کاٹ دی۔ بولی "انہیں کسی امیر کی مصاحبت میں لگوا دیجئے گا، وہاں یہ بہت کچھ سیکھ لیں گے، بات تو ساری پہنچ کی ہوتی ہے۔ اچھے حلقے سے آپ انہیں متعارف کرا دیں گے تو ان کی زندگی سنور جائیگی۔"

شاہ صاحب نے اس طرح حافظے پر زور دیا کہ دونوں آنکھیں بند ہو گئیں، اور پھر انہوں نے تصوّر کے عالم میں درباریوں، اپنے ارادتمندوں اور مریدوں کے متعلق غور کیا۔ اس کے بعد آنکھیں کھول دیں اور اعظم کی طرف اشارہ کر کے ربّو سے کہا "ایک نہایت مناسب اور معقول جگہ ہے لیکن معلوم نہیں یہ اسے پسند کریں یا نہیں؟"

ربّو نے جواب دیا "یہ پسند کریں یا نہ کریں، اگر میں نے وہ جگہ پسند کر لی تو یہ بھی پسند کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"آپ ارشاد تو فرمائیں!"

شاہ صاحب نے کہا "اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے" اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ یعنی ہم زمین پر اپنا خلیفہ بھیجیں گے۔ چنانچہ انسان کو اس زمین کی خلافت عطا فرمائی گئی ہے اور ہم لوگ منطق استدلال

اور اپنی اعلیٰ دانش و بینش کے ذریعے آخر یہ نکتہ پا لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اس سرزمین کے جملہ انسان خلیفۂ ارض بننے کی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہیں اور خداوند تعالیٰ کا فی الارض خلیفہ کا ارشاد کسی خاص شخص کے لئے ہے؛ وہ خاص شخص جو اس خطۂ ارض کا خلیفہ ہو سکتا ہے حضرت جلال الدین اکبر شہنشاہ ہند کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"

ربّو اور دوسرے بعض لوگوں پر شاہ صاحب کی اس تقریر نے بڑا اثر کیا اور ان کی زبان سے بے ساختہ "واہ وا سبحان اللہ" کے کلمات نکل گئے لیکن اعظم پر ابھی شاہی تکلفات مصاحبت اور دربارداری کا سایہ نہیں پڑا تھا اس لئے اسے شاہ صاحب کی باتیں اچھی نہیں لگیں لیکن مصلحت اس کی زبان پر تالا ڈالے رہی۔

شاہ صاحب نے داد طلب نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے بعد اعظم سے کہا۔" میاں صاحبزادے! ہم تمہیں ایک ترکیب بتائیں گے اگر تم نے اس پر عمل کیا تو ہمیں یقین ہے کہ تم بلاشبہ ایک بڑے آدمی بن جاؤ گے صرف فکر کا معاملہ ہے۔ فکر کا رُخ تبدیل کر دو، زندگی مسرت سے گزرے گی۔"

اعظم نے سراپا اشتیاق ہو کر کہا۔" یہ خاکسار جناب کی ہر تجویز اور ہر مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہے۔"

شاہ صاحب نے ترچھی نظروں سے ربّو کو دیکھا اور مسکرا کر فرمایا۔" اچھا تو پھر یہاں سے فراغت کے بعد بات ہو جائے گی۔" پھر ربّو سے پوچھا۔" ارے ربّو! وہ دونوں کہاں ہیں حمیّ شمیّ؟"

ربّو نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا" بندہ پرور! بس آنے ہی والی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد حمیّ اور شمیّ بھی آ گئیں اور محفل میں جان پڑ گئی، سب سے پہلے انہوں نے شاہ صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور سلام کیا۔ شاہ صاحب نے شفقت سے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور سرشار نظروں سے ان کے حسن و جمال کا جائزہ لیا۔

تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب نے حکم دیا۔" حمیّ اور شمیّ کو تم نے فن میں طاق کیا ہو گا۔ ان کے دلنواز چہرے دیکھ کر ہم متأثر ہوئے۔"

پھر رقص کا حکم ہوا۔ حمیّ اور شمیّ نے رقص شروع کر دیا۔ شباب اور نغموں کی یکجائی نے پوری محفل کو مست و سرشار کر دیا۔ شاہ صاحب پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، جھومنے لگے۔ کبھی کبھی بے ساختہ ربّو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور بڑی محبت اور گرمجوشی سے مسلنے لگتے۔ اعظم ان سے رقابت محسوس کرنے لگا تھا۔ ربّو زدیدہ نگاہوں سے اعظم کی بے چینی اور اضطراب محسوس کرتی رہی۔ محفل کے لوگ بے قابو ہونے لگے۔

حمیّ اور شمیّ کے علاوہ بھی کچھ لڑکیاں اپنے ناچ گانے سے محفل کو محظوظ کر رہی تھیں۔ اسی عالم میں شاہ صاحب نے فرمایا۔" میاں برخوردار! موسیقی روح کی غذا ہے، ممکن ہے تم یہ سوچو کہ موسیقی اسلام میں حرام ہے پھر ہم کیوں اتنے اہتمام اور انہماک سے اسے سن رہے ہیں تو سنو برادر عزیز! جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان

تشریف لائے اور یہاں کی ہندو قوم کے مزاج اور عادات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس قوم کو موسیقی کا بڑا شوق ہے اور بھجن اس کی عبادت میں داخل ہے۔ خواجہ غریب نواز نے دینی تبلیغ کے لئے موسیقی جائز قرار دی اور ہندوستان میں قوالی کا رواج ہوا۔ ہم بھی موسیقی کو اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ یہ روح کی غذا ہونے کے ساتھ ہی دل میں آتش شوق بھڑکانے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔"

دنیا کا یہ رُخ اعظم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسلام کے مناطلوں کی یہ تشریح بھی اس نے پہلی بار سُنی تھی پھر جب محفل رقص اور موسیقی میں ڈوبنے لگی تو اس نے لگاوٹوں کے حیا سوز اشارے کنائے دیکھے، سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ شاہ صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر خلوت میں چلے گئے۔ رتّو بھی شاہ صاحب کے ساتھ خلوت میں چلی گئی۔ اعظم تنہا رہ گیا لیکن یہ تنہائی زیادہ دیر نہیں رہی، تقریباً ایک ساعت بعد رتّو واپس آگئی، اعظم نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا کہ اب اس میں وہ آب و تاب باقی نہیں رہی جو خلوت میں جانے سے پہلے تھی۔

رات کے پچھلے پہر ایک نئے ہنگامے کا آغاز ہوا۔ لوگوں نے مے نوشی شروع کر دی، ناچنے گانے والی حسینائیں ساقی گری کرنے لگیں، صاحب استطاعت حضرات نے مہ وشوں کی رانوں پر سر رکھ دیئے اور مست و سرشار نگاہیں ان کے حسین و ملیح چہروں پر گاڑ دیں، ہاتھ شوخی پر اتر آئے، کچھ نے ان نازک اندامو‌ں کے چہرے ہاتھوں میں لے لئے اور ہونٹوں کے ذریعے پیار محبت کی پیغام رسانی شروع کر دی، رتّو دزدیدہ نگاہوں سے اعظم کی ہیجانی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اعظم متضاد کیفیتوں کا شکار تھا۔ حمیّ اور شمّی اپنی ماں کے سامنے اپنے آشناؤں سے ہم آغوش ہوکر بوس و کنار میں محو تھیں۔ اعظم کو شرم آ رہی تھی لیکن شرم کے ساتھ ساتھ دل میں ایک ہیجان بھی برپا تھا۔ جذبات سرکشی اور تمرد پر آمادہ تھے۔ اسی عالم میں ایک پینتالیس پچاس سالہ پستہ قامت سانولی رنگت اور گٹھے ہوئے جسم کا مست و سرشار آدمی رتّو کی طرف بڑھا اور اس نے رتّو کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بولا "ساحل پر بیٹھی کیا کر رہی ہو جانِ من! اِدھر آؤ میری آغوش میں۔ کیا تمہارے سینے میں مدّ و جزر نہیں اٹھ رہے؟ آؤ ہم دونوں بھی اپنی اپنی کشتیاں کھولیں!"

رتّو نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس شخص کا مضبوط ہاتھ پھر سے رتّو کی کلائی پکڑ چکا تھا اس نے اس زور سے رتّو کو اپنی طرف کھینچا کہ وہ ایک گڑیا کی طرح کھنچ کر اس کے سینے سے جالگی۔ رتّو نے اسے دھکا دینے کی کوشش کی لیکن اس شخص نے اسے چمٹا لیا اور اس کے ہونٹ رتّو کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے۔ رتّو نے جب بچت کی کوئی صورت نہ دیکھی تو اس نے بے دردی سے اس کے ہونٹ کاٹ لئے اس نے تلملا کر رتّو کو چھوڑ دیا۔ رتّو چھوڑ کر پھر اعظم کے پاس آگئی اور کہنے لگی "اعظم! مجھے اس وحشی سے بچاؤ۔"

اعظم تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو اشرفیاں نکال کر رتّو کی طرف پھینکیں اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا "یہ صرف بیعانہ ہے جو بعد میں کہو گی سامنے کر دیا جائے گا۔"

اعظم نے اسے ڈانٹ دیا "او بدکار دور رہ — قریب نہ آنا ورنہ تیرا بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔"
شرابی ایسی آواز سے ہنسا، جیسے پیالی میں شراب انڈیلی جا رہی ہو۔ "تو کون ہے دلال، اپنا حق تو بھی لے سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ سکے اعظم کی طرف اچھال دیئے۔
ربو نے اعظم سے چمٹ کر اس شخص سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ ربو کا گرم گرم گداز بدن اعظم کے جسم سے پیوست ہوا تو اس کی حالت غیر ہونے لگی۔
ربو نے اعظم کو ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا "آؤ ہم دونوں اس کمرے میں چل کر اس موذی سے نجات حاصل کر لیں، یہاں موجود رہے تو یہ اسی طرح ستاتا رہے گا۔"
جب یہ دونوں گتھم گتھا ایک دوسرے سے ہم آغوش لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے کی طرف جانے لگے تو اس شخص نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور طنزاً کہا۔ "اچھا جی تو پہلے تمہیں سہی، ہم بعد میں بھگت لیں گے۔"
اعظم کے کانوں میں اس کی یہ آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئی۔
اندر پہنچ کر ربو ایک پلنگ پر گر گئی اور اعظم کو کھینچ کر پاس بٹھا لیا، اس کے سینے کا مدوجزر صاف بتا رہا تھا کہ سخت طوفان آیا ہوا ہے اور اب کسی بھی لمحے اعظم کی تمکنت اور نیک نفسی خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گی۔
ربو نشیلی نظروں سے اعظم کو دیکھتی رہی اور پھر خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "اعظم! تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو!"
اعظم نے ایک بچے کی طرح سادگی سے جواب دیا۔ "اچھا!"
ربو نے اعظم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "اعظم میں تم سے بڑی ہوں نا؟"
"ہاں!"
"تم مجھ سے چھوٹے ہو نا؟"
"ہاں!"
وہ آہستہ آہستہ اعظم کا ہاتھ سہلانے لگی۔ "تم بے سروسامان اور بے یار و مددگار بھی ہو نا؟"
"ہاں!"
آنکھوں کی چمک اور مستی پھیکی پڑنے لگی۔ "اعظم! باہر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ غلط ہے نا؟"
اعظم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "گناہ ہے!"
ربو نے اسے کھینچ کر اپنے آپ پر گرا لیا۔ "گناہ کوئی چیز نہیں ہوتی احمق، یہ تو فطری تقاضے ہیں بھولے میاں، اپنے شاہ صاحب بھی تخلیے میں یہی کچھ کرتے ہیں، میں ایک زمانے تک ان کے ساتھ رہی ہوں، ان سے کئی یادیں بھی وابستہ ہیں، سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔"
اعظم کا صبر و ضبط رخصت ہونے لگا۔ اس کے پائے احتیاط میں لغزش آ گئی۔
ربو نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور جذباتی آواز میں بولی۔ "اعظم! مجھے کسی چیز

کی کمی نہیں ہے۔ میں شریف زادی بھی نہیں ہوں اور اخلاقی حدبندیاں بھی میرے لئے کچھ حیثیت نہیں رکھتیں، جو خواہش جب بھی پیدا ہوتی ہے بے روک ٹوک اور بے خوف اسے مٹا لیتی ہوں نہ جانے کیوں تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو؟ پتہ نہیں، بس اچھے لگے۔ لیکن لیکن" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور اس نے اپنے ہاتھ کھینچ کر آنکھوں پر رکھ لئے، پھر آہستہ سے بولی "لیکن میں تم سے بڑی ہوں اور تم چھوٹے ہو، میں ایک طوائف بھی ہوں۔ میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ اگر میں اپنی خواہشات تم سے بجھاؤں گی تو تم پر ایک طرح کا ظلم کروں گی، میرے لئے جنس کوئی مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ تو وہ ضمیر ہے جس نے تمہارے لئے کراہنا شروع کر دیا ہے، وہ دل ہے جو پہلی بار ایک مرد کے لئے کچھ اور ہی محسوس کر رہا ہے۔ پھر سوچتی ہوں تم ایک سادہ لوح نوجوان ہو، ابھی ناپختہ ہو۔"

اعظم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ربّو آخر کہنا کیا چاہتی ہے؟

پھر ربّو نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی۔ "اعظم! جس بے باکانہ ماحول سے نکل کے ہم دونوں اس کمرے میں آئے ہیں اس میں میں نے یہ کوشش کی تھی کہ تمہارا پندار اور ایمان، آزمائش میں ڈال کر اپنا کام نکال لوں گی۔ اب تم میرے قبضے میں ہو۔" اس کے بعد اس نے اعظم کو حکم دیا "میرے رخسار چومو، میری پیشانی کے بوسے لو، اعظم میرے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لو پھر میں جی بھر کے روؤں گی۔"

اور اعظم نے ایک فرماں بردار خادم کی طرح ان خواہشات کی تعمیل کی، اس نے از خود رفتہ ہو کر ربّو سے اظہار جنوں کیا اور وہ یہاں تک بے قابو ہوا کہ جس بات کا اسے حکم نہ ملا تھا وہ بھی اپنی خواہش سے انجام دینا چاہتا تھا، اس کے دونوں ہاتھ ربّو کو ادھیڑنے اور اس کا بدن بے نقاب کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ ربّو اچانک تڑپ کر الگ ہو گئی۔ اس نے اعظم کو ایک طرف دھکیل دیا اور بولی "بس جناب! بہت ہو گیا۔ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیے تم بھی انہی مردوں کی طرح نظر آتے ہو۔"

اعظم نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بے حد کوشش کی لیکن ناکام رہا، وہ ایک بار پھر ربّو پر جھپٹا لیکن ربّو اب ہوش میں آ چکی تھی، اس نے اعظم کی ہر جارحانہ حرکت ناکام بنا دی، اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، وہ کہنے لگی "اعظم! تم گرتے جا رہے ہو، تمہیں اپنی زندگی اور اپنی ماں کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے، اگر تم آگرے میں بھی وقت، حالات اور وقتی خوشبوں اور ہنگامی لذتوں کے شکار ہو گئے تو پھر تم کیا کرو گے؟ وہاں بڑے جال بچھے ہوئے ہیں، تمہیں اپنی اخلاقی حدوں سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، اعظم! مجھے چھوڑ دو، نہیں تو تمہاری عادتیں خراب ہو جائیں گی، تم خراب ہو جاؤ گے۔"

اعظم پر ہسٹیریا کا سا دورہ پڑ گیا۔ اس نے جوش میں آ کے ربّو کے کپڑے نوچ ڈالنے چاہے، اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا "ربّو! تم نے مجھے پچاس اشرفیاں قرض دی ہیں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت تم اپنا بدن بھی مجھے قرض دے دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہ قرض بھی ادا کر دوں گا۔"

ربّو نے غصّے میں اسے دھکیل دیا اور مشتعل ہو کر بولی۔" تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہیں پناہ دی ہے اور برائیوں سے بچانا چاہتی ہوں اور تم ہو کر اس کنویں میں گرنے کے لئے بے چین ہوئے جا رہے ہو۔"
اعظم کا جنون کم ہونے لگا۔ ربّو اپنے کپڑے درست کرنے لگی، غصّے سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، وہ ایک بار پھر اعظم کو سخت سست سنانے لگی۔" میں چاہتی ہوں کہ تمہاری پیشانی پر کوئی داغ نہ لگے لیکن تم اپنا کردار داغدار کرنے پر تُلے ہوئے ہو! کیوں؟"
اسی لمحے جمّی اور شمّی نشے میں چور لڑکھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں، ان سے معلوم ہوا کہ آج کی محفل کا وقت ختم ہو چکا ہے کہ کہیں کوتوال یا محتسب نہ آ جائے، ربّو نے اعظم سے کچھ اور کہنا چاہا لیکن کچھ کہنے کے بجائے اپنی بیٹیوں کی طرف بڑھی اور ان کی سرپرستی کرنے لگی۔
جب جذبات کی چڑھی ہوئی ندی اتر گئی تو اعظم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے شرمساری سے سوچا کہ شاید اب ربّو اس سے کنارہ کشی اختیار کر لے گی اور شاہ صاحب سے کی ہوئی سفارش واپس لے لے گی۔
ربّو نے دونوں لڑکیوں کو سہارا دے کر نیچے لے جاتے ہوئے بڑی سرد مہری کے ساتھ اعظم سے کہا۔" ذرا سہارا دو اور انہیں نیچے بگھی تک لے چلو۔"
اعظم نے ایک لڑکی کو سہارا دیا اور اس طرح چاروں نیچے پہنچ گئے۔ کوچوان مستعد بیٹھا تھا۔ یہ لوگ بیٹھے اور گاڑی چل دی، راستے میں معلوم نہیں ربّو پر کیا دورہ پڑا کہ وہ آنسوؤں سے رونے لگی، اس نے اعظم کے سینے سے سر ٹکا دیا اور سسکیاں لے لے کر دریافت کیا۔" اعظم میری جان ایک بات بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہو، اب میں اس مکروہ زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔"
اعظم ربّو کی زبان سے یہ بات سُن کر دنگ رہ گیا۔ اسے ربّو پر پیار آ گیا۔ ربّو کے لئے اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی، پھر بھی وہ اچانک شادی کے سلسلے میں کوئی وعدہ کیسے کر سکتا تھا۔ وہ چپ رہا۔
ربّو نے زور سے اس کا شانہ جھنجوڑا۔ بولتے کیوں نہیں، خاموش کیوں ہو؟ تم میرا سودا ادھار اور عارضی کرنے کے بجائے نقد اور مستقل کیوں نہیں کر لیتے، کیا تم یہ قبول نہیں کرو گے؟"
اعظم نے بہت سوچ کر اور بہت ٹھہر ٹھہر کر دبے لفظوں میں کہا۔" تم خود سوچو کہ میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں ربّو، میرا خیال ہے تم مذاق کر رہی ہو۔"
"کیوں نہیں کر سکتے؟" ربّو تلملا گئی۔" کیا اس لئے کہ تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو اور میں بڑی ہوں؟ لیکن میں کہتی ہوں کہ عمر کا فرق کوئی چیز نہیں ہوتا۔ آخر ہمارے بعض بزرگوں نے بھی تو اپنے سے بڑی عمر کی خواتین سے شادیاں کی تھیں؟"
اعظم نے ناگواری سے کہا۔" تمہیں اس موقع پر بزرگوں کی مثال نہیں دینی چاہئے ربّو، میں دراصل اپنی نسبی

اور خاندانی روایات کی بنا پر تمہارے ساتھ شادی کرنے سے معذور ہوں، مگر تم نے اچانک ایسا سوال کیوں کر دیا؟"

"اچھا تو تم بھی وہی ہو۔" رتو نے اس کے سینے سے سر اٹھا لیا۔ "اعظم تمہارا یہ عذر میرے دل میں خنجر اتار سکتا تھا لیکن میں نے ایسے حیلے اور عذر بہت سُنے ہیں، اب میں ان باتوں کی عادی ہوگئی ہوں، اب مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں اپنی اوقات سے خوب واقف ہوں، تم جیسے شرفا ہم جیسی رذیل، مجبور اور بے زبان عورتوں کو داشتہ اور طوائف ہی بنا کر رکھ سکتے ہیں، بیوی نہیں بنا سکتے۔ عزت داروں کی عزت بڑی چیز ہوتی ہے" اور پھر رتو بلک بلک کر رونے لگی۔

اس واقعے کو کئی دن گزر گئے، اس دوران میں رتو بظاہر پرسکون رہی، لیکن اندر ہی اندر جوالا مکھی کا لاوا پگھلتا رہا۔ اس کے لئے اعظم کو حاصل کر لینا کوئی دشوار مسئلہ نہیں تھا لیکن اس نے چونکہ اعظم کو کسی اور طرح محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے شاید وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر جاتی تھی اور جب بھی جاتی تھی اعظم کی سفارش ضرور کرتی تھی، آخر شاہ صاحب نے ایک دن حتمی وعدہ کر لیا کہ جب وہ آگرے جائیں گے تو اعظم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور وہاں اس کی ہر طرح مدد کریں گے۔

روانگی سے ایک دن پہلے شاہ صاحب نے اعظم کو طلب کر لیا۔ رتو اعظم کو لے کر شاہ صاحب کی خدمت میں روانہ ہوئی، راستے میں اس نے اعظم سے کہا "مجھے ڈر ہے کہ جب تم آگرے پہنچ جاؤ گے اور تمہارا کام بن جائے گا تو تم مجھے بھلا دو گے کیا میرا ڈر صحیح ہے؟"

اعظم کو اس وقت صرف اپنے کام کی پڑی تھی، اس نے رتو کی بات نظر انداز کر کے پوچھا "اس وقت شاہ صاحب نے کیوں بلایا ہے وہ کیا باتیں کریں گے؟"

رتو نے خشک لہجے میں جواب دیا "میں نہیں جانتی کہ وہ تم سے کیا گفتگو کریں گے لیکن ایک بات یاد رکھنا تم ان سے کسی قسم کے بحث مباحثے میں ہرگز نہ الجھنا۔ وہ مخالفت بالکل برداشت نہیں کر سکتے۔"

شاہ صاحب نے دونوں کی شاندار پذیرائی کی اور رتو کو اپنے قریب بٹھا لیا، بڑی میٹھی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "رتنالہ! ان صاحبزادے کی سفارش تم نے کی تھی اس لئے ہم نے کافی غور و خوض کے بعد ایک تجویز سوچی ہے اگر یہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

رتو نے پیار سے شاہ صاحب کو دیکھا "آپ فرمائیے یہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ وہ مسکرائی "میں ضمانت لیتی ہوں۔"

شاہ صاحب نے کانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا "تم نے سُنا ہوگا کہ جہاں پناہ اکبر اعظم نے ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کا نام دین الٰہی ہے۔ بادشاہ صاحب خود کو خلیفۃ الارض کہتے ہیں، اگر یہ برخوردار کوئی قباحت محسوس نہ کریں تو دین الٰہی قبول کر لیں، ہم ابوالفضل سے ان کی سفارش کر دیں گے اور ان کی زندگی

سنور جائے گی۔"

اعظم نے ہمت کر کے سوال کیا۔ "قبلہ وکعبہ! جسارت کی معافی چاہتا ہوں، شہنشاہ اکبر اعظم جو کچھ کہتے ہیں، کیا وہ واقعی درست ہے؟"

شاہ صاحب نے قرآن پاک کا سہارا لیا۔ فرمانے لگے "صاحبزادے! اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی اور اس حاکم کی جو تم میں سے ہو، کیا شہنشاہ اکبر ہمارے حکمران نہیں ہیں؟ یقیناً اولی الامر منکم کی تعریف میں آتے ہیں، اور پھر ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ جن حالات میں تم مبتلا ہو ان میں حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے!"

اعظم نے بے دلی سے دریافت کیا۔ "اس کے علاوہ کوئی تجویز؟"

شاہ صاحب بُرا مان گئے۔ غصے میں بولے۔ "معلوم ہوتا ہے تم بڑے کم عقل آدمی ہو، میاں ایمان کے کئی درجے ہیں، ان میں سے ایک ایمان باللسان یعنی ایمان بذریعۂ زبان ہے اور دوسرا ایمان بالقلب ہے یعنی ایمان دل کی گہرائی سے یعنی یہ اختیار تمہیں رہتا ہے کہ تم دین الٰہی زبان سے تو قبول کر لو لیکن دل سے قبول نہ کرو اور دل میں اسلام ہی کی یاد اور ایمان باقی رکھو۔"

اعظم نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ "قبلہ اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ یہ تو صریح منافقت ہے۔"

"بکواس، یاوہ گوئی!" شاہ صاحب بپھر گئے۔ "آخر مصلحت اندیشی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ یعنی ایسا جھوٹ جو کسی مصلحت کا تابع ہو اس سچ سے اچھا ہے جس سے فتنہ پیدا ہو!"

ربّو نے دخل دیا۔ "لیکن اگر اعظم دین الٰہی صرف زبان سے قبول کر بھی لے تو اس عمل میں کونسا ایسا سچ موجود ہے جس سے فتنے کا دروازہ کھلتا ہو؟"

شاہ صاحب نے پہلے تو لاحول پڑھی پھر ارشاد فرمایا۔ "عورت واقعی ناقص العقل ہوتی ہے، اری نیک بخت کیا افلاس کچھ کم لعنت ہے۔ مفلسی میں تو انسان خدا تک کو بھول جاتا ہے، کیا یہ کچھ کم فتنہ ہے؟ اگر یہ لعنت اور یہ فتنہ مصلحت آمیز جھوٹ سے نہ دبایا گیا تو اس نوجوان کا سب کچھ تباہ ہو سکتا ہے۔"

اعظم کے قدم ڈگمگا گئے اور اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ شاہ صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ الخاموشی نیم رضا۔ فوراً حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "برخوردار! ہم نے تمہیں جو ترکیب بتائی ہے اس میں زبان کا ایمان تو دین الٰہی کے ساتھ رہے گا اور دل کا ایمان اسلام پر رہے گا اور یہ صورت شرعاً جائز ہے۔"

دونوں شاہ صاحب کی منطق اور دلائل کے قائل ہو کر واپس آ گئے۔ ربّو کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھ گئی، سامنے قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ اعظم ربّو کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور پیار سے اس کی طرف دیکھنے

لگا۔ رتو نے آئینے میں عکس دیکھا اور بڑی سچائی سے یہ بات محسوس کی کہ اس میں اور اعظم میں کتنا فرق ہے، اعظم بالکل نوجوان لڑکا دکھائی دے رہا تھا اور رتو ادھیڑ عمر کی ایک پختہ کار لیکن پرکشش عورت، پھر بھی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔ "اعظم! اگر میں تمہیں اچھی طرح یہ یقین دلا دوں کہ میں اپنے ذلیل پیشے سے تائب ہو جاؤں گی تو کیا تم مجھ سے شادی کر لو گے؟"

اعظم رتو کے کچھ اور نزدیک ہو گیا پھر ہچکچا کر بولا۔ "خانم اگر ہم دونوں چاہیں تو شادی کے بغیر بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔" وہ چپ ہو گیا اس نے رتو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر شرما کر کہا۔ "میرے والد بھی میری والدہ کے علاوہ تین عورتیں رکھتے تھے، تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اس معاشرے میں بڑائی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ کس تعلقے دار یا کس امیر کی کتنی داشتائیں ہیں، داشتاؤں کی تعداد سے آدمی کی امارت کا اندازہ لگایا جاتا ہے"، اس کی گردن جھک گئی۔ "اگر تمہاری کوششوں سے میرا تعلقہ واپس مل گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مرتے دم تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

رتو کے دل پر چھری چل گئی، وہ جھنجلا کر رہ گئی اور چراغ پا ہو کر بولی۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو اعظم! میں تم سے کچھ اور باتیں کر رہی ہوں، تم کچھ اور جواب دے رہے ہو۔ تم مجھے میری صداقت کا خوب حوصلہ دے رہے ہو کیا میں رنڈی سے بڑھ کر کچھ اور نہیں ہوں۔ کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے؟"

اعظم نے کھسیا کر چپ سادھ لی۔

رتو مسہری پر گر گئی اور چادر میں منہ چھپا کر روتی رہی۔

ابھی شاہ صاحب کا قافلہ دو کوس ہی گیا ہو گا کہ اس پر لٹیروں نے حملہ کر دیا۔ پورے قافلے میں ہلچل مچ گئی۔ شاہ صاحب بدحواس ہو گئے، دوسرے لوگوں میں سے بیشتر لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس موقع پر اعظم نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ تلوار لے کر لٹیروں کا مقابلہ کرنے لگا۔ اس نے بڑے پرجوش انداز میں شاہ صاحب کو تسلی دی۔ "قبلہ و کعبہ! آپ بالکل نہ گھبرائیں، یہ بدمعاش آپ کو میری موت کے بعد ہی کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں!" بڑے سخت مقابلے کے بعد لٹیرے بھگا دیئے گئے۔ اعظم شاہ صاحب کے آس پاس رہ کر ہی لٹیروں کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور کافی زخمی ہو گیا تھا۔ شاہ صاحب پر اعظم کی بے جگری اور جاں نثاری کا بڑا اثر ہوا۔ آگرہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

آگرے پہنچ کر شاہ صاحب نے اسے اپنے گھر ہی کے ایک حصے میں ٹھہرا لیا اور ماہر جراحوں سے اس کے زخموں کا علاج کروایا۔ اس دور میں انہوں نے کئی بار اعظم کو یہ یقین دلایا کہ "تم کوئی غیر نہیں ہو، ہمارے بیٹے ہو۔ تم نے جس جرأت اور بہادری سے ہماری حفاظت کی ہے اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔"

زخموں کے اندمال میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا۔ اس دوران میں ایک شخص اعظم کی عیادت کے بہانے آیا۔

اور چوری سے رتو کا ایک خط اسے دیا۔ لکھا تھا :۔

"اعظم! میری زندگی! میں یہ سن کر سخت پریشان ہوں کہ تم لٹیروں کے ہاتھوں سخت زخمی ہو گئے ہو، تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ اس خبر نے میری راتوں کی نیند اور دن کا چین چھین لیا ہے، افسوس یہ ہے کہ میں وہاں تمہیں دیکھنے کے لئے بھی نہیں آ سکتی، بس دعا کر سکتی ہوں اور کر رہی ہوں، خدا تمہیں جلد صحت یاب فرمائے۔"

اعظم! میں آواگون کی قائل نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ تم میرے لئے نئے نہیں ہو، اجنبی نہیں ہو۔ میں تم سے پہلے بھی کہیں مل چکی ہوں۔

مجھے دنیا جہان کی نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہیں لیکن میری روح تشنہ ہے اعظم! میں بہت غیر آسودہ ہوں روح کسی گم گشتہ شے کی تلاش میں سرگرداں اور پریشان ہے، معلوم نہیں وہ شے ملے گی بھی یا نہیں؛ میں تمہیں پا کر یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ شاید وہ گم گشتہ شے تمہی ہو لیکن..... لیکن..... نہیں، نہیں، جی میں آتا ہے کہ تمہاری پیش کش قبول کر لوں اور اپنی بقیہ زندگی تمہاری قربت میں گزار دوں لیکن پھر معلوم نہیں کیوں دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ تم بھی مجھے اپنی داشتہ یا رنڈی سمجھ کر رکھو، اس میں وہ لطف اور لذت نہیں ہے جس کی مجھے خواہش ہے، دل یہ سوچ کر مرجھا جاتا ہے کہ تم طبقات کی روایات کے لوگ ہو اور اپنی روایات سے ہٹ کر نہیں چل سکتے۔"

اعظم نے اس خط کا جواب بڑی مشکل سے لکھا اور لکھ کر اسی شخص کے حوالے کر دیا۔ اس نے لکھا تھا :۔

"رتو! ابھی میں بستر علالت پر ہی دراز ہوں، امید ہے اگلے ہفتے اس لائق ہو جاؤں گا کہ کسی کی مدد کے بغیر چل پھر سکوں شاہ صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں، مجھے اپنا بیٹا کہتے ہیں۔

رتو! یہاں زندگی کچھ ٹھہر سی گئی ہے کسی بات میں دل نہیں لگتا۔ تمہاری قربت کا خواہشمند ضرور ہوں، تم نے صحیح لکھا ہے ہم اپنی طبقاتی روایات کے خلاف کس طرح بغاوت کر سکتے ہیں؟"

جس حصے میں اعظم رہتا تھا اس کے پیچھے زنانخانہ تھا اور وہاں سے مختلف نسوانی آوازیں آتی رہتی تھیں، ایک آواز نہایت مترنم تھی اور ایک مہینے صاحب فراش رہنے کے دوران میں اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شاہ صاحب کی لڑکی شافعہ کی آواز ہے۔ لڑکی کی صورت اور عادات و اطوار کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اعظم نے اس کی بابت یہ ضرور محسوس کر لیا تھا کہ یہ لڑکی ذرا خود سر، تندخو اور گرم مزاج ہے۔ اکثر اس کی ڈانٹ پھٹکار کی آواز آتی رہتی تھی، غالباً گھر کے ملازمین اس سے بہت نالاں رہتے تھے۔

اس نے اپنے بستر ہی پر پڑے پڑے یہ خوش خبری بھی سن لی کہ شاہ صاحب نے ابوالفضل سے اس کا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے اور وہ اعظم کے صحتیاب ہوتے ہی اسے ابوالفضل سے ملا دیں گے۔

شاہ صاحب کو اعظم کی ذات میں غالباً دو ایسی خوبیاں نظر آ گئی تھیں جن کی وجہ سے وہ ابوالفضل اور اکبر اعظم کی خدمت میں پہنچائے جانے کے لائق تھا ایک خوبی یہ تھی کہ وہ وفادار جاں نثار تھا اور دوسری یہ تھی کہ اس کے چہرے پر ایک

خاص قسم کی سادگی اور معصومیت پائی جاتی تھی، ان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس ہندو خال کا آدمی اگر ذہین ہی ہو تو بڑے اہم کام انجام دے سکتا ہے اور لوگ اسے سمجھے بغیر غلطی کر کے آسانی سے اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اعظم کی صحت یابی کے بعد شاہ صاحب نے اسے ابوالفضل سے ملا دیا اور تعارف کراتے ہوئے کہا "جناب والا! یہ وہی نوجوان ہے جس کا میں نے جناب سے ذکر کیا تھا۔ اسے اگر جگت گرو جہاں پناہ اکبر اعظم کے مریدوں میں شامل کروا دیا جائے تو عین فقیر پروری ہو گی۔"

ابوالفضل نے اسے ایک غلط انداز نگاہ سے دیکھا اور شاہ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اعظم نے محسوس کیا کہ ابوالفضل کی شخصیت بڑی گہری ہے، وہ اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس دن تعارف سے زیادہ اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاہ صاحب کی ایما پر وہ ابوالفضل کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ ابوالفضل سرسری طور پر شاہ صاحب کی خیریت دریافت کر کے اسے نظرانداز کر دیتا تھا۔

اس دن ابوالفضل کے پاس بہت سے آدمی جمع تھے۔ ان میں ہندو مسلمان دونوں ہی تھے۔ اعظم بھی ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا، ابوالفضل تقریر کر رہا تھا۔

"شہنشاہ خلیفۃ الارض ہیں، انسانوں کی روزی ان کی ذات سے وابستہ ہے اس لئے ہمارا بادشاہ اَن داتا بھی ہے، پورے ملک کی موت اور زندگی پر شہنشاہ کو اختیار حاصل ہے۔ ہمارا بادشاہ خدا کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ ایسی ہمہ صفت اور خدائی اوصاف سے متصف ذات کو سجدہ کرنا واجب ہے۔"

اعظم تقریر کے آخری حصے پر کچھ چونکا، ابوالفضل کہہ رہا تھا۔

"جب تم لوگ شہنشاہ کے مریدوں میں داخل ہونے کے لئے پہنچو گے تو تمہیں فوراً سجدے میں گر جانا ہو گا، اس کے بعد جب مریدی کی رسم ادا کی جائے گی تو تم لوگ اپنی اپنی دستاریں اپنے داہنے ہاتھوں میں لے کر کھڑے ہو جاؤ گے۔ شہنشاہ جو اس وقت شہنشاہ کے بجائے جگت گرو ہوں گے تمہیں سجدے میں جانے کا اشارہ کریں گے تم لوگ اپنی دستاریں ہاتھوں میں لئے ہوئے سجدہ میں چلے جاؤ گے پھر جگت گرو آہستہ آہستہ تمہارے قریب پہنچیں گے اور تمہیں باری باری سجدے سے اٹھا کر تمہاری دستاریں اپنے ہاتھ سے تمہارے سروں پر رکھ دیں گے۔ اس طرح تم جگت گرو کے مریدوں میں داخل ہو جاؤ گے۔"

اعظم کے دل میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کے خلاف کئی بار باغیانہ جذبہ پیدا ہوا لیکن ابوالفضل کی بھاری بھرکم شخصیت نے یہ جذبہ کچل کر رکھ دیا۔

اسی دن اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنے والے اتوار کو یہ رسم ادا کی جائے گی، کیونکہ اتوار سورج کا دن کہلاتا تھا اور شہنشاہ سورج کی بڑی عزت کرتا تھا، وہ اس کے تقدس اور عظمت کو اتنا مانتا تھا جتنا پارسی آتش پرست مانتے ہیں، ہندو مسلمانوں کا ایک غول تھا جو ابوالفضل کی سرکردگی میں قلعے میں داخل ہوا، آگے آگے ابوالفضل تھا اور پیچھے پیچھے

دھوتیوں اور کرتوں میں ملبوس مُریدی کے امیدوار تھے۔ دھوپ میں ان کے سانولے سیاہ اور گندمی چہروں پر پسینہ شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ دور میدان میں شاہی بارگاہ ایستادہ تھی۔ بارگاہ اس عظیم الشان شاہی خیمے کو کہتے ہیں، جس میں بیک وقت تقریباً دس ہزار آدمی سما سکتے ہیں۔ جب یہ لوگ بارگاہ میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے بہت سے آدمی جمع تھے۔

بارگاہ کے آخری سرے پر شاہی تخت بچھا ہوا تھا۔ شہنشاہ اکبر ابھی تشریف نہیں لائے تھے مورچھل برداروں اور دوسرے خدمتگاروں کے پرے تخت کے آس پاس بادشاہ کی آمد کے منتظر تھے، سب کے کان اس نقارے کی آواز سننے کے منتظر تھے جو بادشاہ کی آمد پر بجایا جاتا تھا۔

ابوالفضل اپنے آدمیوں کو لئے ہوئے تخت کے کسی قدر قریب پہنچ کر رک گیا اور انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بارگاہ میں ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں انسان موجود ہی نہ ہوں، ہاں لوگوں کے دلوں کی مضطربانہ اضطراری دھڑکنیں صاف سنی جا سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد نقارے پر چوٹ پڑی اور ایک طرف سے حمد سرائی کی آوازیں آنے لگیں یہ آوازیں سنتے ہی حاضرین مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ نقارے اور حمد سرائی کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں یہاں تک کہ یہ آوازیں بارگاہ میں داخل ہو گئیں اور ان کے ساتھ ہی خالی تخت سراپردے میں سے بادشاہ کا چہرہ نمودار ہوا تو تمام حاضرین سجدے میں گر گئے پھر ان کی گردنیں اٹھیں تو شہنشاہ تخت پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔

اعظم نے ہمت کر کے بادشاہ کو دیکھنے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا کہ بادشاہ کی وضع قطع اسلامی نہیں، ہندوانہ ہے

کچھ دیر بعد ابوالفضل آگے بڑھا اور بادشاہ کے قریب اس چھوٹی سی دیوار کے پاس پہنچ گیا جو شاہی تخت کو احاطے میں لئے ہوئی تھی۔ ابوالفضل بادشاہ کے آگے تین بار جھکا اور سیدھا ہوا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا عرض کرتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو بادشاہ نے ایک خدمتگار سے اشارے میں کچھ کہا، اس کے فوراً بعد ایک بار پھر نقارے نے شور بلند کیا اور بادشاہ تخت سے نیچے آ گیا۔ لوگ ایک بار پھر سجدوں میں گر گئے لیکن اس بار ان کی دستاریں ان کے داہنے ہاتھ میں تھیں اور سر سجدوں میں تھے۔ ابوالفضل بائیں طرف، بادشاہ سے دو قدم پیچھے سائے کی طرح چل رہا تھا۔ بادشاہ نے باری باری دستاریں ہاتھ میں لے کر پہنانی شروع کر دیں، جب اعظم کا نمبر آیا تو ابوالفضل نے خاص طور پر عرض کیا۔ "جگت گرو! یہ سادہ لوح ذہین اور جاں نثار نوجوان چیت پور کا تعلقہ دار ہے، اتنی دور سے محض جہاں پناہ کی قدم بوسی اور جگت گرو کی مریدی کی امید میں حاضر ہوا ہے!"

اکبر نے اسے سجدے سے اٹھایا، دستار اس کے سر پر رکھی، ایک ثانیے کے لئے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔

اعظم شاہی رعب کی وجہ سے ہوش و حواس میں نہ تھا۔

بادشاہ پھر اپنی جگہ پر واپس آ گیا اور مریدوں کو بآواز بلند نصیحتیں کرنے لگا۔ "لوگو! جب تم ایک دوسرے سے

ملو تو سلام میں پہل کرنے والا اللہ اکبر کہے اور دوسرا جواب میں جلِ جلالہٗ کہے۔
لوگو! کہا جاتا ہے کہ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے سب اُمّی اَن پڑھ تھے، ہم بھی اُمّی ہیں۔
اے حق کے تلاش کرنے والو! ہمارے دین میں گوشت خوری حرام ہے۔ ہماری عقل یہ ماننے پر قطعاً آمادہ نہیں ہوتی کہ انسان اپنے معدے کو جانوروں کا قبرستان بنائے۔
اسی طرح ہم تمہیں ہدایت کرتے ہیں کہ تم شیطان کا وجود ہرگز تسلیم نہ کرنا۔ کیونکہ اگر شیطان کا وجود مان لیا جائے کہ شیطان خدا کی مرضی نہ ہونے کے باوجود انسانوں کو ورغلا کر گمراہ کر دیتا ہے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ شیطان بھی خدا کے برابر کوئی قوت ہے جو اپنی مرضی سے انسانوں کو ورغلا رہا ہے۔"
حاضرین بادشاہ کی اس موشگافی پر واہ کرنے لگے بادشاہ بدستور عقل و دانش کی باتیں کرتا رہا۔
لوگو! جس طرح جسم بیمار پڑتا ہے اسی طرح عقل بھی بیمار پڑتی ہے تو یہ بھی علاج چاہتی ہے چنانچہ ہم نے اس کا علاج بھی شروع کر دیا ہے۔
میرے مریدو! کہا جاتا ہے کہ پیغمبروں پر بڑے بُرے وقت پڑتے رہے ہیں، کیا ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان پر یہ وقت کیوں پڑتے ہیں؟
ابوالفضل نے کمال جرأت سے جواب دیا "جہاں پناہ جسے پیغمبروں پر وقت پڑنا فرمایا ہے ہیں اسے ہم لوگ خدا کی طرف سے اپنے پاک بندوں کی آزمائش کہتے ہیں"
اکبر ہنسا، کہنے لگا "آزمائش! خوب! خدا جو عالم الغیب ہے اور یہ جانتا ہے کہ کس شخص کے مقدر اور مستقبل میں کیا ہے۔ وہ کسی کا امتحان کیوں لے گا؟ جو ذاتِ اقدس امتحان کے نتیجے سے باخبر ہو اس کا امتحان لینا ایک شاندار لطیفے سے زیادہ کچھ نہیں ہے"
حاضرین نے بادشاہ کی نکتہ رسی کی خوب خوب داد دی۔ ابوالفضل نے شرمسار اور لاجواب ہو کر گردن جھکا دی۔
اچانک اکبر کھوپڑے کے راجہ مان سنگھ سے مخاطب ہوا "مان سنگھ! افسوس کہ تم ابھی تک شاہی مریدوں کے حلقے سے باہر ہو جبکہ ابوالفضل جیسا دانائے روزگار اور بیربل جیسا طباع اور حاضر دماغ شاہی مریدوں میں داخل ہو چکے ہیں"
راجہ مان سنگھ نے ادب سے گردن جھکالی، اور نگاہیں زمین میں گاڑ کر جواب دیا "مہابلی کا اگر شاہی مریدوں میں داخل ہونے سے یہ مقصد ہے کہ جہاں پناہ کا یہ سیوک شاہی جاں نثاروں میں داخل ہو جائے تو مہابلی کو خوب اندازہ ہے کہ یہ ناچیز کسی عہد و پیمان کے بغیر ہی جاں نثاری دکھاتا چلا آ رہا ہے اور مہابلی پر اپنا جیون نچھاور کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے لیکن اگر حکمت گرو شاہی مریدوں میں داخل ہونے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ مغل راج کا یہ سیوک اپنا دھرم چھوڑ کر دینِ الٰہی میں داخل ہو جائے تو یہ خادم نہایت عجز و انکسار سے یہ عرض کرنے کی

جرأت کرے گا کہ کچھ اہے کا مان سنگھ مسلمان نہ ہو سکتا ہے لیکن کوئی اور دھرم ہرگز قبول نہیں کریگا۔"
اکبر خاموش ہو گیا۔

اس وقت دھوپ میں بڑی تمازت تھی، تھوڑی دیر بعد کسی خدمت گار نے اکبر کی خدمت میں سورج کرانت نامی ایک شفاف پتھر پیش کیا۔ اکبر نے وہ پتھر سورج کے سامنے رکھ کر اس سے آگ جلانے کا حکم دیا۔ خدمتگار دور کھلے میدان میں چلا گیا، وہاں اس نے سورج کرانت کے پیچھے روئی رکھ کر، پتھر سے سورج کی شعاعیں گذاریں، ذرا سی دیر میں روئی جلنے لگی۔ اس آگ سے لکڑی کا ایک ٹکڑا جلایا گیا اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ اکبر نے یہ آگ اپنے مریدوں اور خدمتگاروں میں تقسیم کر دی اور انہیں ہدایت کی کہ "یہ مقدس آگ ایک سال تک روشن رکھی جائے۔ اور آگ سے انجام پانے والے کام اس مقدس آگ سے انجام دیئے جائیں، آئندہ سال پھر اسی طرح آفتابی آگ سورج کرانت سے حاصل کر کے مریدوں میں تبرکاً تقسیم کی جائے گی۔"

جب شاہی مرید رخصت ہونے لگے تو اکبر نے مسلمان مریدوں کو انگشتریاں عطا کیں جن پر اللہ اکبر کندہ تھا، اور ہندو مریدوں کو زنار عنایت کیے جن کی کنیوں پر بھی اللہ اکبر کھدا ہوا تھا۔

دربار کے برخاست ہوتے وقت کسی درباری نے دربار کے مشہور شاعر شیری کا ایک شعر اکبر کے گوش گزار کیا اور کہا کہ شیری اپنے اشعار کے ذریعے دین الٰہی کے خلاف نفرت پھیلا رہا ہے۔ شیری کے ایک شعر کا مفہوم تھا، "شاہ نے اس سال نبوت کا دعویٰ تو کر دیا ہے اگر خدا نے چاہا تو اگلے سال بادشاہ نبی سے ترقی کر کے خدا ہو جائے گا۔"

اکبر نے ناگواری سے کہا۔ "بخدا ہم نبوت کے مدعی نہیں ہیں، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قلمرو کے مختلف عقائد اور مذاہب کے لوگ ایک لڑی میں پرو دیئے جائیں، اسی مقصد کے لئے ما بدولت نے الٰہی آئین تیار کرایا ہے۔ ما بدولت کو یہ یقین ہے کہ اگر شیری نے واقعی ہم پر دعوائے نبوت کا بہتان باندھا ہے اور یہ امید کرتا ہے کہ ہم آئندہ سال خدائی کے دعوے دار ہوں گے تو یہ سراسر افترا پردازی ہے اور ایک نہ ایک دن شیری پر بھی دین الٰہی کی سچائی منکشف ہو جائے گی اور وہ بھی شاہی مریدوں میں داخل ہو جائے گا۔"
اکبر کی اس پیشگوئی سے پورا دربار سناٹے میں آگیا۔

اس کے بعد تو اعظم کی قسمت ہی بدل گئی اسے انعام و اکرام میں اتنا کچھ مل گیا کہ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھنے لگا، اسے اس عالم میں رلّو کا خیال بھی آیا لیکن اب وہ اپنی دانست میں جس بلند مرتبے پر پہنچ چکا تھا، وہاں رلّو جیسی بازاری عورت کی کوئی گنجائش نہیں تھی، رلّو کے خط آتے رہے اور وہ انہیں پڑھ پڑھ کر پھاڑتا رہا۔

دراصل اس کے ذہن اور دل پر شاہ صاحب کی لڑکی شافعہ کی سُریلی آواز اتر کر چکی تھی جو جوان بھی تھی اور شریف زادی بھی، رفتہ رفتہ رلّو کا ذکر اور اس کے خط اعظم کے لئے بوجھ بننے لگے، آخر ایک دن رلّو کو لکھ دیا۔

"جیسا کہ میں نے پہلے اطلاع دی تھی کہ میں شاہی مریدوں میں داخل ہو چکا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے جگت گرو اکبر سے کچھ وعدے کرنے پڑے ہیں، میں نے گوشت خوری ترک کر دی ہے اور بازاری عورتوں سے پرہیز کرنے کا

مصمم ارادہ کر لیا ہے ویسے بھی ہم دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں، اب میں کسی اور ہی منزل کا رہ نورد ہوں ..
"مجھے یہ معلوم ہے کہ تمہیں میرے اس خط سے سخت تکلیف پہنچے گی لیکن اب یہ تلخی گوارا کئے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں ہے، اگر تمہیں میرے اس یاس انگیز خط سے دکھ پہنچے تو میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے ضمیر کی مدد سے صبر حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس ضمیر سے جس نے بارہا تمہیں اس بات کا — احساس دلایا ہے کہ میں تم سے عمر میں چھوٹا ہوں اور تم مجھ سے بڑی ہو اور تمہیں ایک شریف زادے کی زندگی تباہ نہیں کرنی چاہیئے اس لئے میری درخواست ہے کہ تم آئندہ مجھے کوئی خط نہ لکھنا، وہ رقم جو تم نے مجھے مرحمت فرمائی تھی میں عنقریب کسی معتبر آدمی کے ذریعے واپس کر دوں گا، میں تمہاری ایک ایک پائی چکا دوں گا فکر مند ہرگز نہ ہونا۔"

جب وہ یہ خط لکھ چکا تو اسے کچھ تکلیف سی محسوس ہوئی اور دل میں آئی کہ — خط پھاڑ کر پھینک دے۔ اسے ربّو سے بڑی انسیت محسوس ہوئی لیکن اب جو کچھ وہ تھا یا ہونے والا تھا اس میں ربّو کی گنجائش نہیں تھی۔

اس خط کے جواب میں ربّو نے جو خط لکھا وہ بڑا جذباتی تھا اس نے لکھا تھا۔
"اعظم! تمہارے خط سے مجھے وہ صدمہ نہیں پہنچا جس کی تم توقع کر رہے ہو گے میں نے تو خود ہی یہ کہہ کر اپنے آپ کو مایوس کر لیا تھا کہ ہم دونوں کے طبقات میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے، طبقات کا یہ روایتی فرق اسی دن کھل کر سامنے آ گیا تھا جب تم نے میرا بدن قرض کے طور پر طلب کیا تھا۔ میں بھی یہی کہتی ہوں کہ بدقسمتی سے میں رنڈی بھی ہوں اور تم سے عمر میں بڑی بھی ہوں۔ ہم دونوں میں وابستگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے تم سے نہ جانے کس عالم میں ایسی بات کہہ دی جو مجھے کسی طور پر نہ کہنی چاہیئے تھی، تمہاری خواہش کی پیروی میں، میں آئندہ تمہیں کوئی خط نہیں لکھوں گی۔

رہ گیا رقم کا معاملہ تو تمہیں اچھی طرح یاد ہو گا کہ وہ میں نے کس مقصد کے لئے بچا رکھی تھی سر دست مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مگر جلد ہی اس کی ضرورت پڑے گی۔ میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو تم اپنے ہاتھوں سے اسے میری تجہیز و تکفین میں لگا دینا۔

اعظم! میری دعا ہے کہ خدا تمہیں ہمیشہ ہمیشہ سیدھے راستے پر چلائے۔

ربّو سے تعلقات ٹوٹ جانے پر اعظم کچھ کھویا کھویا سا رہا مگر پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ ربّو سے تعلقات منقطع ہونے ہی میں اس کی عافیت ہے۔

اسی کرب اور اذیت کے عالم میں ایک دن اسے شاہ صاحب نے اپنے خاص حجرے میں طلب فرمایا۔ اس وقت وہ بڑی اچھی کیفیت میں تھے۔ انہوں نے اعظم کو اپنے قریب بٹھا لیا اور اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا وہ بہت دیر تک شفقت و محبت کی باتیں کرتے رہے، وہ ایک صاف دل اور کھلی ہوئی طبیعت کے مالک تھے، انہوں نے بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر فرمایا "آج ہم اپنی شادی کی بات تم سے کرنا چاہتے ہیں" اس

کے بعد آنکھیں بند کر کے شاہ صاحب گویا مراقبے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آئے اور دونوں آنکھیں کھول دیں "اگر شافعہ تم سے منسوب کر دی جائے تو تمہیں اس کی شکل میں نہ صرف ایک سلیقہ شعار شوہر پرست حسین جمیل اور صالح بیوی مل جائے گی بلکہ تم ترقی کے کچھ اور مدارج بھی طے کر سکو گے۔ تم صالح، شریف اور سمجھدار نوجوان ہو اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں شافعہ سے وابستہ کر کے ذرّے کو آفتاب بنا دیں، تمہیں منظور ہے؟"

اعظم نے ابھی تک شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ابھی کچھ اور ترقیاں کرنا چاہتا تھا اور ترقی کرنے کا منصوبہ شادی سے کھٹائی میں پڑ سکتا تھا لیکن اس وقت فرار کی راہ بند ہو چکی تھی۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا "بندہ ناچیز حاضر ہے، قبلہ شاہ صاحب اس خاکسار کے لئے جو کچھ طے فرمائیں گے یہ اسے عین سعادت اور باعث برکت سمجھ کر قبول کرے گا۔" شاہ صاحب سے انکار کی صورت میں اس کی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو جاتیں، اگر سے میں آکر وہ خاصا مصلحت پسند ہو گیا تھا۔

شاہ صاحب نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "ہمیں تم سے اسی جواب کی امید تھی، جزاک اللہ ہمیں یہ بات تمہاری توقع کے خلاف اس وقت اس لئے کرنی پڑی کہ ابوالفضل تمہیں عنقریب کسی اہم کام پر کہیں باہر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ کہیں جانے سے پہلے ہم تمہیں شافعہ سے وابستہ کر دیں، شافعہ تمہاری قسمت بدل کر رکھ دے گی۔"

شاہ صاحب نے عجلت سے یہ کام کر ڈالا، شافعہ اعظم سے منسوب ہو گئی اور شادی کے چند ہی دنوں بعد اعظم کے سارے خوشگوار خوابوں کے تار و پود بکھر گئے، شافعہ کی صورت شکل بے مثل تھی، لیکن اس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ اعظم کو اپنا نمک خوار سمجھتی تھی۔ اعظم ایک ایسا شخص تھا جس پر اس کے باپ کے احسان تھے، اس لئے اس کے دل میں اعظم کے لئے کوئی عزت نہیں تھی۔ شافعہ کی بات چیت میں وہی تلخی تھی جو اعظم گھر کے ملازموں کی ڈانٹ ڈپٹ کی شکل میں بارہا سن چکا تھا۔ رتو کا جذبۂ پرستاری شافعہ میں نام کو نہ تھا۔ اسے ایک بار پھر رتو یاد آ گئی۔ شادی سے وہ خوش نہیں ہوا، اب وہ چاہتا تھا کہ اسے تعلقہ چیت پور کی بازیابی کے احکام مل جائیں اور وہ واپس چلا جائے، ویسے اس نے شافعہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے درباری اثر و رسوخ سے شادی کی تھی، اسی دوران خوش قسمتی سے ابوالفضل نے اسے بلا لیا اور تخلیے میں لے جا کر سمجھایا "نوجوان! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم تم سے کوئی کام لیں۔"

ابوالفضل بہت فکرمند معلوم ہوتا تھا، وہ رات کی تاریکی میں اعظم کو لے کر ایک خفیہ راستے سے قلعے میں داخل ہو گیا۔ اعظم کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ برچھی بردار ملا جسے ابوالفضل کے چند ناقابلِ فہم لفظوں نے خاموش رکھا۔ ابوالفضل اعظم کو لئے ہوئے محل کی ایک ایسی کھڑکی کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا جو غالباً ایک عرصے سے نہیں کھلی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ تین بار دستک دی، کھڑکی کے برابر کی دیوار میں ایک چھوٹا سا شگاف ہو گیا، دو مسلح پہرے داروں نے ابوالفضل کو سلام کیا اور پھر یہ دونوں اس کے ساتھ کئی کمرے اور غلام گردشیں پار کرتے ہوئے

ایک نہایت منقش اور خوشنما دروازے پر پھر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئے، یہاں مہابلی اکبر ایک قیمتی چھپر کھٹ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ ابوالفضل اور اعظم نے تعظیماً سجدہ ادا کیا۔ جب یہ دونوں سجدے سے اٹھے تو اکبر نے دونوں پاؤں سمیٹ لئے اور جو دو کنیزیں وہاں موجود تھیں انہیں رخصت ہو جانے کا اشارہ کیا۔

اکبر نے اعظم کو سوالی نظروں سے دیکھا پھر بے پرواہ ہو کر ابوالفضل سے کہا: "ابوالفضل! تمہاری حد سے بڑھی ہوئی دانش تمہارے لئے مصیبت بن گئی ہے، تم ہمارے شیخو پر اعتماد کیوں نہیں کرتے؟"

ابوالفضل نے سر جھکا کر عرض کیا: "شہزادے سلیم کا مزاج مہابلی سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے لیکن غلام نے جو کچھ عرض کیا تھا شاید مہابلی نے اس کی روح پر غور نہیں فرمایا۔ غلام یہ کب کہتا ہے کہ شہزادے صاحب خود ایسے ہیں کہ وہ مغل سلطنت اور مہابلی کے اقتدار کے خلاف کانٹے بو ئیں گے۔ غلام تو یہ عرض کر رہا تھا کہ سادہ لوح شہزادے کے گرد و پیش جو خوشامدی جمع ہو گئے ہیں وہ انہیں ورغلا کر آزمائش میں مبتلا کر سکتے ہیں، غلام نے اپنے مخبروں سے سنا ہے کہ نوجوان شہزادے کے خوشامدی انہیں یہ باور کرا رہے ہیں کہ حکومت کے مزے لوٹنے کی حقیقی عمر یہی ہوتی ہے لیکن مہابلی کی ذاتِ والا صفات کی موجودگی میں، ان بداندیشوں کے قول کے مطابق شہزادے صاحب زندگی اور حکومت سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔"

اکبر خاصا فکر مند ہو گیا، اسے شیخو سے بڑی محبت تھی۔ تاسف انگیز لہجے میں بولا: "ابوالفضل لوگ سمجھتے ہیں کہ حکومت بڑے مزے کی چیز ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ حکومت ایک پل صراط ہے، تلوار کی دھار سے زیادہ باریک، ذرا سی بھول چوک حاکم کو ہلاک کر سکتی ہے، یہاں باپ کو بیٹے اور بیٹے کو باپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔" پھر سرد آہ بھر کر بولا: "ابوالفضل! کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ ہمارا شیخو ہم پر تلوار کھینچ لے؟"

"جگت گرو!" ابوالفضل نے تسلی دی "ایسا ممکن تو نہیں لیکن احتیاط لازم ہے، شہزادے میاں ابھی نادان ہیں، اور نادانی میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"اچھا!" اکبر نے لمبی سانس لی۔ "تو ہم دکن کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے بداندیشیاں اور شکوک و شبہات شیخو کے دل و دماغ سے پاک کر دیں گے۔"

ابوالفضل نے اعظم کی طرف اشارہ کر کے کہا: "مہابلی! یہ نوجوان جو جگت گرو کے مریدوں میں داخل ہے اور مشہور درویش زین شاہ کی دامادی کا شرف بھی حاصل کر چکا ہے، یہ اپنی جاں نثاری، معصوم صورتی اور خرد مندی کے پیش نظر اس اعزاز کا مستحق ہے کہ اسے ہوشیاری سے شہزادے کے خدام میں داخل کر دیا جائے۔ یہ شہزادے اور اس کے بداندیش اور خوشامدی مصاحبین کی خبریں مہابلی کو بھیجتا رہے گا۔ اس اہم کام کے لئے اس نوجوان کا انتخاب اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے چہرے کی سادہ لوحی کے پیچھے چھپی ہوئی عقلمندی آسانی سے نہیں تاڑ سکتا۔"

اکبر نے عقابی نظروں سے اعظم کو دیکھا اور ابوالفضل کی بیان کردہ خصوصیات بھانپنے کی کوشش کی، کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے لیکن ہم اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ جس خطرے کا تم اشارہ کرتے رہے ہو، وہ صرف تمہارا وہم ہے۔ سلیم ہم سے بغاوت نہیں کر سکتا، ہرگز نہیں، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔"

اس کے بعد یہ دونوں واپس آ گئے۔ اعظم جلد از جلد جیت پور واپس جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب جو خدمت اس کے سپرد ہوئی تھی اس نے اسے غیر معینہ مدت کے لئے وطن جانے سے محروم کر دیا تھا۔ ہاں ایک بات اس کی خوشی کی تھی اور وہ یہ کہ اس طرح وہ شافعہ سے دور رہے گا اور شہزادے کی خدمت میں زیادہ وقت گزار سکے گا۔

اکبر دکن روانہ ہونے والا تھا اور دار الحکومت میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ اکبر کے ہٹتے ہی شہزادہ سلیم بغاوت کر کے حکومت پر قبضہ کرے گا لیکن اکبر نے اس افواہ کے حقیقی امکانات اس طرح کم کر دیئے کہ دکن روانگی سے قبل اس نے شہزادے کو پہلی بار "شہنشاہ" کہہ کر مخاطب کیا اور اپنا ولی عہد نامزد کر دیا۔ شہزادے کی جاگیر میں اجمیر کے صوبے کا اضافہ کیا گیا۔ بخشش میں ہاتھی، جواہرات اور ایک لاکھ اشرفیاں مرحمت فرمائی گئیں، گویا اس طرح اکبر نے اپنے شیخو کا دل جیت لینے کی کوشش کی تھی، اس کے باوجود ابوالفضل نے نہایت ہوشیاری سے اعظم کو شہزادے کے خدام میں داخل کر دیا اور اسے ہدایت کی کہ شہزادے کے خوشامدی اس کے یا حکومت کے خلاف جو کچھ بھی کہیں اس کی معمولی سے معمولی اطلاع بھی نہایت ہوشیاری سے ابوالفضل کو روانہ کی جائے۔

شہزادہ اپنی نئی جاگیر اجمیر کے لئے روانہ ہو گیا۔ اعظم بھی ہم رکاب تھا، اسے شافعہ سے دور ہونے کی خوشی ہو رہی تھی۔ جب وہ فتح پور سیکری سے گزر رہا تھا تو اسے ربو کا خیال آ گیا، بے اختیار اس کا دل چاہا کہ اس سے ملتا چلے لیکن شہزادہ سلیم کی بعجلت روانگی نے یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

اعظم نے بہت جلد وہ سب کچھ دیکھ لیا اور سن لیا جس کا ابوالفضل ذکر کر چکا تھا۔ اجمیر میں داخل ہوتے ہی شہزادے کو اس کے خوشامدیوں نے مشورہ دیا کہ بادشاہ اس وقت دکن کی مہمات میں الجھا ہوا ہے اس لئے دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ اسی وقت آگرے پہنچ کر تاج و تخت پر قبضہ کر لیا جائے، شہزادہ اس پر آمادہ ہو گیا اور فوراً آگرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اعظم نے نہایت ہوشیاری سے ابوالفضل کو یہ خبر روانہ کر دی۔

واپسی میں فتحپور سیکری کے قریب پڑاؤ ہوا۔ شہزادہ سلیم احتیاطاً یہاں ٹھہر گیا۔ اعظم کی نظروں میں ماضی گھومنے لگا۔ بھائی کی خود غرضی، ربو سے عجیب حالات میں ملاقات اور اس کی ہمدردی، شاہ صاحب، لٹیروں سے جنگ اور زخمی ہونا، علاج، شافعہ کی سریلی آواز، شادی، ابوالفضل، دین الٰہی، اکبر اور شہزادہ سلیم، خاص کر وہ منظر جہاں باپ اپنے بیٹے کی نافرمانی پر ملول اور افسردہ نظر آیا تھا۔ اعظم دنیا اور دنیا والوں سے بہت مایوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ اسے تو صرف اپنے بھائی سے تکلیف پہنچی تھی لیکن یہاں تو شہزادہ سلیم اپنے مثالی محبت کرنے والے باپ کے خلاف جنگ آزما تھا۔ مایوسی کے اس دشت میں صرف ربو کی ذات نظر آتی تھی، جس میں ہمدردی اور انسانیت پائی جاتی تھی۔ ربو کی یاد نے پھر دل میں کروٹ لی اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ایک بار ربو سے ضرور ملے گا اور اس سے اپنے

تند و تلخ خطا کی معافی مانگ لے گا۔
اعظم سرائے والوں کی نظروں سے بچتا بچاتا پھاٹک میں داخل ہوا تو اس کے کانوں میں رقص و موسیقی کی صدائیں گونجنے لگیں، اوپری حصے میں سازوں اور آوازوں کا ایک ہنگامہ گرم تھا، یہ بے تکلف اوپر پہنچ گیا۔ یہاں کچھ نئی لڑکیاں ناچ گانے میں مشغول تھیں۔ اعظم نظروں ہی نظروں میں ربّو اور اس کی بیٹیوں کو تلاش کرنے لگا لیکن تینوں میں سے ایک بھی نظر نہیں آئی۔ اعظم مایوس ہو کر نیچے اترا اور ربّو کی قیامگاہ کی طرف چل دیا۔ یہاں سب سے پہلے اس کی مڈبھیڑ مہاشے چندولال جی سے ہوئی۔ اب چونکہ اعظم میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ صحت مند جسم تھا، امیرانہ لباس تھا اس لئے مہاشے جی اسے پہچان نہ سکے، اعظم نے انہیں سلام کیا خیریت معلوم کی اور پوچھا "مہاشے جی! کیا ربّو جی بھی تشریف رکھتی ہیں؟"
مہاشے چندولال جی نے غور سے اعظم کو دیکھا اور پہچان کر بولے۔ "تو یہ تم ہو؟ کیوں جی ایسی بھی کیا بے مروتی؟ سنتا ہوں کہ اب تم اکبر بادشاہ تک پہنچ گئے ہو، ربّو جی تمہیں اکثر یاد کرتی رہتی ہیں"
اعظم نے جواب دیا "میں انہی سے تو ملنے آیا ہوں"
مہاشے چندولال جی اسے ربّو کے دروازے پر چھوڑ کر چلے گئے۔
اعظم دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ ربّو مسہری پر دوسری طرف منہ کئے لیٹی تھی، دونوں لڑکیاں اس کے سرہانے رہی تھیں۔
ایک لڑکی نے اعظم کو دیکھتے ہی خوش ہو کر ماں سے کہا۔ "اماں! ذرا دیکھئے تو کون آیا ہے آپ سے ملنے"
ربّو نے کروٹ بدلی اور جیسے ہی اعظم پر نظر پڑی وہ ٹھٹھر گئی، کچھ دیر ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم اس نے پہلے کی طرح کروٹ بدل کر چپ سادھ لی۔
اعظم مسہری کے قریب پہنچ گیا۔ "ربّو! میری محسنہ! میں تم سے ملنے آیا ہوں، ادھر دیکھو میری طرف!"
ربّو نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "نکل جاؤ یہاں سے، بھلا ایک بازاری عورت سے ملنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے، میں تمہاری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں، تم ابھی اسی وقت نکل جاؤ اس کمرے سے!"
"دیکھو ربّو!" اعظم کہنے لگا "میں اپنی ماں کے پاس بھی جا سکتا تھا لیکن وہاں نہیں گیا، تمہارے پاس آیا ہوں، کیا تم بھی مجھے دھتکار دو گی؟"
ربّو پکار رہی تھی "میں کچھ نہیں جانتی، تم یہاں سے چلے جاؤ، اسی وقت چلے جاؤ"
"اچھا!" اعظم نے مایوسی سے کہا "تم کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں لیکن جانے سے پہلے تمہارا حساب چکانا چاہتا ہوں"
ربّو تلملا کر اعظم کی طرف گھومی۔ اعظم نے غور سے ربّو کو دیکھا، وہ اب دُبلی ہو چکی تھی، چہرہ ستا گیا تھا۔ رُخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں، دُبلے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں کافی بھیانک لگ رہی تھیں۔
اعظم نے بے چینی سے پوچھا "کیا تم بیمار رہو؟"

"نہیں"۔ ربو کی طبیعت ٹھہر گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے "ہاں ذرا بخار آرہا ہے"۔
"کب سے؟"
ربو نے آنکھیں بند کرلیں، ایک لڑکی نے جواب دیا "جس دن آپ کا خط موصول ہوا تھا اسی دن سے"۔
"اچھا!" اعظم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر موضوع بدل دینا چاہا لیکن غلطی سے اور زیادہ مہلک گفتگو چھڑ گئی۔
کہنے لگا۔ "ربو! کچھ پتہ ہے تمہیں؟ ہم نے شادی کرلی"۔
"اچھا!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "مبارک ہو!"
"میں تمہیں دعوت دیتا لیکن یہ سب کچھ عجلت میں ہوا اور اس کے فوراً بعد مجھے ایک مہم پر بھیج دیا گیا"۔
"تم خوش ہو۔ بس یہی ٹھیک ہے"۔ ربو نے حسرت سے کہا۔
"خوش کیا۔ بس زندہ ہوں، جیسی بھی گزر رہی ہے ٹھیک ہے"۔
اور شاہ صاحب کیسے ہیں، ان کے گھر میں تو خیریت ہے، وہاں سب لوگ ٹھیک ہیں؟"
"ہاں شاہ صاحب خیریت سے ہیں، مجھ پر بڑے مہربان ہیں"۔ اس نے دانستہ یہ ذکر گول کر دیا کہ اس کی شادی شاہ صاحب کی لڑکی شافعہ سے ہوئی ہے، اس نے موضوع بدل کر ربو کو چھیڑنے کے لئے کہا "تمہیں شاہ صاحب کا بڑا خیال ہے؟"
ربو گرم ہو گئی۔ "اعظم! تمہیں میرے اور شاہ صاحب کے بارے میں کسی قسم کی رائے زنی کا کوئی حق نہیں پہنچتا"۔
اعظم نے زہریلی ہنسی سے کہا "خوب! میں کون ہوتا ہوں تمہارے اور ان کے خصوصی مراسم میں دخل دینے والا۔ میں معذرت خواہ ہوں"۔
"اعظم!" ربو پوری قوت سے چیخی۔ "تمہیں یہ جلی کٹی سنانے کا حق کس نے دیا؟ تم اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ میں کچھ بھی سہی لیکن تم لوگوں کی طرح منافق نہیں ہوں، تم مجھے برا سمجھتے ہو اور چوری چھپے مجھ سے ملنے بھی آ دھمکے ہو، یہ کہاں کی شرافت ہے؟" وہ مسہری پر گر گئی۔
اعظم اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔
اعظم کے دل پر افسردگی اور مایوسی نے کچھ ایسا غلبہ کیا کہ وہ اُداس رہنے لگا۔ انسان کی خود غرضیاں، آلام اور مصائب سے بھری ہوئی زندگیاں اسے نڈھال کرنے لگیں، اس نے دیکھا کہ ہر طرف ایک ہاہاکار مچی ہوئی ہے، قیامت سے پہلے قیامت ہے، ہر شخص نفسا نفسی کا شکار ہے، یہاں کوئی کسی کا نہیں ہے، ہر شخص اپنے مطلب سے مطلب رکھتا ہے، جسے دیکھو اپنی غرض کا بندہ ہے، اپنی خواہشات کا غلام ہے اسے یہ بھی دیکھا کہ شہنشاہ اکبر کا تاج و تخت خود بخود شہزادے کو ملنے والا تھا لیکن وقت سے پہلے ہی حاصل کرنے کے لئے شہزادہ اپنے شفیق باپ اکبر کی آگرے میں غیر موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوشاں ہے۔

شہزادے نے اپنی سپاہ کی مدد سے آگرے کا قلعہ محاصرے میں لے لیا اور قلعے دار سے کنجیاں طلب کرنے لگا۔ اس موقع پر شہزادے کی دادی جرأت کے ساتھ قلعے سے باہر آگئیں اور انہوں نے شہزادے کو اس فضول فعل سے باز رکھنا چاہا۔ شہزادے نے محاصرہ تو اٹھا لیا لیکن اس کے سر میں بغاوت کا سودا اسی طرح سمایا رہا۔ وہ اپنی سپاہ کو لے کر الہ آباد چلا اور وہاں پھر باپ سے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اعظم سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ یہیں اسے یہ خبر ملی کہ اکبر ابوالفضل کو دکن میں چھوڑ کر آگرے پہنچ چکا ہے۔

اسی دوران اعظم کو ایک بہت بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

اعظم بہت گہری نیند سویا ہوا تھا کہ کسی نے جھنجوڑ کر اسے بیدار کر دیا۔ رات کا پچھلا پہر ہوگا۔ بیدار کرنے والا ننگی تلوار لئے جلاد کی طرح سر پر کھڑا اسے یہ حکم سنا رہا تھا کہ شہزادہ سلیم نے اسے اسی وقت طلب کیا ہے!

وہ ہولساں اور خوف زدہ شہزادے کے پاس پہنچا، شہزادہ اپنے مشیروں کے درمیان گھرا بیٹھا تھا اور کسی مسئلے پر گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی شہزادے کے سامنے پہنچا، شہزادہ کھڑا ہو گیا اور قہر آلود نظروں سے اس نے سوال کیا۔ "یہ بدبخت! کیا یہ درست ہے کہ تو ہمارے درمیان رہ کر ابوالفضل کی جاسوسی کر رہا ہے؟"

اعظم کی جان نکل گئی، اس نے گڑگڑا کر شہزادے کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہا لیکن شہزادے نے غصے میں اس کے رخساروں پر کئی طمانچے رسید کر دیئے، خوشامدی ہنسنے لگے۔ اس کے بعد شہزادے نے اسے کھڑے رہنے کا حکم دیتے ہوئے زور سے آواز دی "نرسنگھ دیو!"

جواب میں ایک بڑی اور گھنی مونچھوں والا راجپوت جوان بڑی تمکنت سے قدم اٹھاتا ہوا شہزادے کی طرف بڑھا۔ جب وہ شہزادے کے قریب پہنچا تو اسے حکم ملا۔

"نرسنگھ دیو! تم اسی وقت منتخب گھڑ سواروں کے ساتھ اپنی ریاست روانہ ہو جاؤ، ابوالفضل دکن سے آگرے واپس آرہا ہے۔ جب وہ قصبۂ انتری اور سرائے برار کے درمیان پہنچ جائے تو اس پر اچانک حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دینا۔"

اس کے بعد شہزادہ، اعظم سے مخاطب ہوا۔ "اور تم نمک حرام! اگر تم واقعی ابوالفضل کے جاسوس ہو تو جاؤ اور اسے مطلع کر دو کہ وہ عنقریب عدم آباد کو سدھار جائے گا۔"

پھر شہزادے نے اپنے ہاتھ سے نرسنگھ دیو کی کمر میں بیش قیمت لڑی اور ایک جڑاؤ تلوار انعام میں دی۔ نرسنگھ دیو تعمیل حکم کی یقین دہانی کے لئے شہزادے کے سامنے دو زانو ہو گیا اور پھر سیدھا ہو کر الٹے قدموں چلتا ہوا اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

پھر شہزادے نے ابوالفضل کے خلاف ایک زوردار تقریر کی، اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس نے کہا:۔

"ابوالفضل وہ بدبخت شخص ہے جس نے ہمارے پدربزرگوار کو گمراہ کر دیا ہے اور یہی وہ نالائق اور ذلیل آدمی ہے جو شہنشاہ کو ہمارے خلاف ورغلاتا رہتا ہے۔"

شہزادہ دیر تک اسی طرح بگڑتا رہا اور اعظم دل ہی دل میں ابوالفضل کی سلامتی کی دعا کرتا رہا۔

ایک عرصے تک شہزادے اور بادشاہ کے درمیان کش مکش جاری رہی۔ اسی دوران شہزادے کی سوتیلی ماں اسے منانے کے لئے الہ آباد پہنچیں اور نامعلوم کس طرح شہزادے کو آگرے چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس وقت تک نرسنگھ دیو بھی اپنا کام ختم کر کے واپس آچکا تھا۔ اس نے ابوالفضل کا سر لاکر شہزادے کے قدموں میں ڈال دیا۔ شہزادے نے حقارت سے ابوالفضل کے منہ پر تھوک دیا اور کہا "بول! تیری وہ افترا پردازی اب کیا ہوئی؟ تیرا بے مثل لیکن گمراہی اور بے دینی سے پُر دماغ اپنی ہڈیوں کی ہانڈی میں ہمارے قدموں پر پڑا ہے اور تیری بے نور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن اپنا عبرتناک انجام نہیں دیکھ سکتیں! تیرے منہ میں زبان موجود ہے مگر لن ترانیوں کی قوت نہیں رکھتی۔"

اعظم کے لئے دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ شہزادے نے آگرے پہنچ کر باپ کے سامنے عقیدت، احترام اور شرمساری سے گردن جھکا دی، باپ کا دل پگھل گیا اور اس نے شہزادے کو معاف کر دیا۔

ابوالفضل کی موت نے بادشاہ سے اعظم کا رابطہ منقطع کر دیا تھا، اب پھر وہی بے کیف اور اداس زندگی تھی اور اعظم کا تحمل تھا۔ شافعہ نے اسے کوئی سُکھ نہیں دیا۔ وہ اس سے کھنچا کھنچا ہی رہا اور وہ اور زیادہ اداس ہو گیا۔

ویران دن اور اداس راتوں کے ناگ اسے بُری طرح ڈسنے لگے، اب وہ کسی خاص موقع کا انتظار کر رہا تھا تاکہ جہاں پناہ سے مل کر اپنے تعلقے واپس جانے کی اجازت حاصل کرے۔

شہنشاہ اکبر جھروکے میں بیٹھے شاہی مریدوں کو درشن دے رہے تھے، مریدوں کے اژدہام میں اعظم بھی موجود تھا۔ بادشاہ نے جیسے ہی مریدوں پر نظر ڈالی، اعظم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیں۔ کبھی دونوں ہاتھ اٹھا کر زور زور سے ہلانے لگتا۔ بادشاہ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ایک خدمتگار بھیج کر اسے طلب کر لیا۔ وہ اکبر کے سامنے پہنچا تو اکبر بہت اداس اور مضمحل تھا۔ بادشاہ نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور دریافت کیا۔ "آج کل تو کس خدمت پر مامور ہے؟"

اعظم نے رو رو کر اپنی ساری روداد بادشاہ کے گوش گزار کی۔ ابوالفضل کے ذکر پر بادشاہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ آہستہ سے بولے "شیخو نے ابوالفضل کو ہلاک کر کے ما بدولت کو سخت قلبی اور ذہنی صدمہ پہنچایا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے شیخو کو معاف کر دیا مگر اب وہ پھر ہم سے باغی ہو گیا ہے۔" شہنشاہ کچھ دیر چپ رہے پھر انہوں نے اعظم سے دریافت کیا "اب تو کیا چاہتا ہے؟"

اعظم نے اپنے تعلقے کی بازیابی کی درخواست کی۔ اکبر نے کہا "بہتر ہے، تیرا تعلقہ تجھے واپس مل جائے گا۔ لیکن واپسی سے پہلے تجھے مابدولت کا ایک ضروری کام انجام دینا ہو گا۔"

اعظم اکبر کے قدموں میں جھک گیا۔ "بسر وچشم۔ جنّت گردی کی اطاعت غلام کا مذہب ہے۔"
بادشاہ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آگیا۔ دھیرے دھیرے گویا ہوئے "تمہیں مابدولت کا ایک پیغام لے کر شیخو کے پاس الہ آباد جانا ہوگا۔ وہ ایک بار پھر ہم سے ناراض ہو کر الہ آباد چلا گیا ہے، ہم اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے۔"
پھر زیر لب اس طرح بڑبڑانے لگا "شیخو کا بھائی مراد مرا، ابوالفضل کا غم ہمیں جھیلنا پڑا۔ مابدولت کا سینہ غموں سے چھلنی ہے۔ اس پر شیخو کی نافرمانیاں اور بغاوتیں" یہ کہتے کہتے ہندوستان کا عظیم فرماں روا بچوں کی طرح رو پڑا۔ اعظم بھی آبدیدہ ہو گیا۔
اس کے بعد بادشاہ نے اعظم کو شیخو کے لئے کچھ بیش بہا تحائف، سفید لومڑی کی کھال کی ایک نیم آستین اور ایک نصیحت نامہ دے کر الہ آباد روانہ کر دیا۔ یہ المناک واقعات اعظم کو بری طرح دل برداشتہ کر رہے تھے۔ سہ پہر کو جس وقت وہ شہزادے کے پاس پہنچا، اس وقت شہزادہ بہت برہم تھا، محل کے باہر میدان میں جلاد دو آدمیوں کی کھالیں کھینچنے میں مصروف تھے ان میں سے ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا حسین وجمیل سبزہ آغاز نوجوان۔ دونوں کی چیخ پکار اور کربناک شور سے میدان گونج رہا تھا، اعظم کا دل دہل گیا۔
شہزادہ اعظم کو لے کر اندر چلا گیا اور اس نے باپ کا نصیحت نامہ اور تحائف وصول کئے۔

اعظم کو جستجو تھی کہ جن بدنصیبوں کی کھالیں کھینچی گئی ہیں، ان کا جرم آخر کیا تھا؟ رات کو ایک خواجہ سرا نے اسے بتایا کہ ان میں سے ایک نوجوان تو شہزادے کا منظور نظر تھا اور دوسرا شخص شہزادے کا وقائع نویس ــــ معلوم نہیں کس طرح دونوں میں تعلقات استوار ہو گئے اور وہ چوری سے بھاگ نکلے۔ شہزادے نے اطلاع پاتے ہی دونوں کو راستے سے گرفتار کروالیا اور رقابت میں دونوں کی کھالیں کھنچوادیں۔
اعظم اور زیادہ اداس ہو گیا اس کے جی میں آئی کہ وہ دنیا ترک کر دے، کسی ویرانے میں چلا جائے اور اپنی بقیہ زندگی خدا کی یاد میں گزار دے لیکن سر دست یہ ناممکن تھا۔
شہزادے نے باپ کے نصیحت نامے کے جواب میں نہایت منکسرانہ خط لکھا لیکن اپنے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔
اعظم شہزادے کا جواب لے کر سلطانی بارگاہ میں پہنچا۔ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد دکن سے شہزادے دانیال کی موت کی خبر پہنچی۔ شیخو کی نافرمانی اور دانیال کی موت کے دو تیر ادھر جا بلی کے دل میں پیوست ہو گئے اس وقت اعظم کو ایسا محسوس ہوا جیسے پورے ہندوستان میں اکبر سے زیادہ غمگین اور مصیبت زدہ شخص کوئی اور نہیں ہے۔
غم واندوہ کے اس عالم میں اکبر نے دو انسانوں کی کھال کھنچوائے جانے کا لرزہ خیز واقعہ سنا تو اسے بڑا قلق ہوا۔ اس نے افسوس سے کہا "ہم تو کسی جانور کی کھال بھی نہیں کھنچوا سکتے۔ شیخو نے کیسے دو انسانوں کی کھالیں کھنچوا دیں۔"
اکبر نے اعظم کی خدمات کے صلے میں نہ صرف اس کے تعلقے پر قبضے کا حکم جاری کیا بلکہ کچھ اور علاقہ بھی مرحمت فرمادیا

لیکن یہ حکم بھی دیا کہ ابھی وہ آگرے ہی میں ٹھہرا رہے۔"
اسے روانگی کے لئے بے چینی سے بادشاہ کی اجازت کا انتظار تھا۔ اسی دوران میں بادشاہ کی ماں کا انتقال ہو گیا اور پورا آگرہ سوگ میں ڈوب گیا۔ اعظم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بادشاہ کے دل پر اس صدمے نے کیسا اثر کیا ہو گا؟ اس کی اکبر سے بے پناہ محبت اور عقیدت بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ خبر بھی گشت کرنے لگی کہ بادشاہ سخت بیمار ہیں۔ شہزادہ سلیم بھی باپ کی علالت کی خبر سن کر آگرے آگیا، اُسے یقین تھا کہ اکبر اب جانبر نہ ہو سکے گا، اسی امید اور تاج و تخت کی ہوس میں شہزادے کو آگرے میں رہنا پڑا لیکن شاہی محل میں بیمار باپ کے پاس جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ البتہ شہزادہ سلیم کا پندرہ سولہ سالہ بیٹا شہزادہ خرم اپنے دادا کی خدمت میں موجود تھا اور تیمار داری میں مصروف تھا۔ سلیم اسے بھی واپس بلا لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ مخالفین کہیں خرم کا کام تمام نہ کر دیں۔ لیکن خرم نے بیمار دادا کی دیکھ بھال کے لئے اپنے باپ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور وہیں موجود رہا۔
اعظم بڑی کوشش سے کسی نہ کسی طرح مہابلی کے آخری دیدار کو پہنچ گیا۔ ہندوستان کا باسٹھ ترسیٹھ سالہ عظیم مغل حکمران آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ شہزادہ خرم ایک طرف اداس بیٹھا ہوا تھا۔
اکبر آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا "شیخو! تم کہاں ہو؟ مابدولت تمہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھو ہمارا دل غموں سے چور ہے، سینہ صدمات سے چھلنی ہے شیخو! کیا تمہیں اپنے باپ پر رحم نہیں آتا؟"
شہزادہ خرم نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے بادشاہ کو مخاطب کیا "دادا جان! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ذرا آنکھیں کھولیے، دیکھئے یہ کون آیا ہے؟ آپ کا ایک جاں نثار مرید!"
اکبر نے یہ سوچ کر بے چینی سے آنکھیں کھول دیں کہ شاید اس کا شیخو آگیا۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "کون؟ شیخو! ہمیں یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے، تم اتنے نافرمان ہرگز نہیں ہو سکتے۔ ادھر آؤ ہمارے قریب، ہمارے سینے سے لگ جاؤ"
شہزادہ خرم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "دادا جان! یہ شیخو بابا نہیں ہیں بلکہ آپ کا ایک جاں نثار مرید ہے، اعظم!"
اعظم نے محسوس کیا کہ اکبر کی بینائی ٹھیک سے کام نہیں کر رہی ہے۔ بادشاہ نے آنکھیں دبائیں، پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں "کون؟ اعظم! اچھا تم ہو، غالباً تم اپنے تعلقے واپس جانے کی اجازت لینے آئے ہو۔ تم جا سکتے ہو" اکبر نے آنکھیں بند کر لیں "اب تمہارا کام ختم ہو چکا ہے"
اس کے بعد بادشاہ نے شیخو کو پھر یاد کیا "ہاں اگر کسی طرح شیخو کو ہمارے پاس بھیج سکو تو ضرور بھیج دینا۔ اس وقت ہم ہندوستان کے بادشاہ نہیں ہیں، صرف شیخو کے باپ ہیں۔ شیخو سے کہو کہ کوئی شہنشاہ تمہیں ملنے کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ ایک باپ اپنے بیٹے سے ملنے کی درخواست کر رہا ہے"
اعظم غم زدہ ہو کر باہر آگیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ بادشاہ کی یہ درخواست شیخو کے نزدیک ہرگز توجہ کے قابل نہیں

ہے اور اتنی بڑی مملکت کے شہنشاہ کی یہ حقیر سی آخری خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

دوسرے دن بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور پورا ملک سوگ میں ڈوب گیا۔ بادشاہ کی رحلت کے فوراً بعد شہزادہ سلیم قلعے میں داخل ہوا اور ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر کے نام سے آگرے کے تخت پر جلوہ افروز ہو گیا۔

اعظم نے سامان درست کیا اور شافعہ کو لے کر اپنے تعلقے کے لئے روانہ ہو گیا۔ راستے میں فتحپور سیکری کی سرائے میں وہ اس خیال سے اتر پڑا کہ شاید آئندہ اس طرف آنا نہ ہو اس لئے ربّو سے آخری ملاقات کر کے اس کا قرض چکا دیا جائے، دل کے کسی گوشے میں ربّو کی یاد نے انگڑائی لی۔ وہ اس کے پاس جانے سے گھبرا رہا تھا اس نے شافعہ کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ربّو کے پاس چلے لیکن شافعہ ربّو کے دروازے تک جا کر رک گئی اور اس نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ اعظم کو تنہا ہی ربّو کے پاس جانا پڑا۔

وہ ربّو کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا اور مہاشے چندولال جی اندر سے نکل رہے تھے۔ وہ اعظم کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے "تم آ گئے؟ اُسے تمہارا ہی انتظار تھا!"

اعظم خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ ربّو کی جگہ ہڈیوں کا ایک پنجر جھلنگے میں پڑا ہوا تھا۔ مہاشے چندولال جی دوبارہ اندر داخل ہوئے اور انہوں نے ربّو کو اس طرح مخاطب کیا جیسے کسی بہرے کو مخاطب کر رہے ہوں "ربّو بی بی! تمہیں جن میاں جی کا انتظار تھا، وہ آ گئے ہیں!" اس کے بعد انہوں نے اعظم سے کہا "میاں جی! جب بُرا وقت پڑتا ہے تو کوئی کام نہیں آتا۔ دونوں لڑکیاں بھی نہ معلوم کس کے ساتھ بھاگ گئیں" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "میاں جی! سچ پوچھو تو اس پیشے کی کسی عورت کا ہم نے کبھی اچھا انجام نہیں دیکھا"

ربّو کی بے بسی پر اعظم کا دل بھر آیا۔ وہ بے اختیار جھلنگے پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"ربّو! میں آ گیا ہوں، آنکھیں کھولو"

ربّو نے آنکھیں کھولیں تو آنسو بہہ نکلے۔ چہرے پر خوشی کی تازگی اس طرح نمودار ہوئی جیسے قبرستان میں چاندنی کھل جائے۔

معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اعظم از خود رفتہ ہو گیا۔ اس نے ربّو کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ ربّو آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی اس نے کان لگا کر سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اعظم! مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ میں نے اسی لئے تم سے وہ رقم واپس نہیں لی تھی۔ وہ اشرفیاں ہی تو ہم دونوں کے درمیان تعلق اور رابطہ برقرار رکھے ہوئے ہیں"

شافعہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے جب اپنے شوہر کو ایک طوائف کے ساتھ [illegible] نہ وابستگی اور والہانہ شیفتگی کے عالم میں دیکھا تو یہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے منہ بنا کر زمین پر تھوک دیا اور کچھ کہے سنے بغیر غیظ و غضب کے عالم میں پیر پٹختی ہوئی واپس چلی گئی۔ اعظم نے اپنے رویّے سے کسی ندامت اور شرم کا اظہار نہیں ہونے دیا اور شافعہ کو وہاں

سے جاتا دیکھ کر روکنے کی کوشش نہیں کی، وہ ربّو کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے اس کے رخسار کی ہڈیوں اور ہونٹوں کے والہانہ بوسے لے رہا تھا اور ہڈیوں کا وہ پنجر اپنی پوری کوشش اور ہمت سے اعظم کی آغوش میں سمٹا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب ربّو پوری طرح اعظم کی آغوش میں سما گئی تو اس نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی اور اطمینان بخش اور پرسکون سانس لی۔ وہ بڑی مشکل سے بول سکتی تھی۔ وہ اٹکتے اٹکتے بولی "اعظم مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی، میں بھی کتنی بدنصیب اور اکیلی ہوں اعظم۔ میری دو بیٹیاں تھیں اور تھیں مجھ سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئیں اور تیسری بیٹی کی شکل بھی میں ایک زمانے سے نہیں دیکھ سکی ہوں، مگر مجھے خوشی ہے کہ میری تیسری بیٹی ایک شریف گھر میں ہے اور اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ تم میرے مرنے کے بعد اس کے پاس جانا اور اس سے کہنا کہ تمہاری ماں آخری سانس تک تمہارے لئے تڑپتی رہی۔ تم اسے یہ نہ بتانا کہ اس کی ماں ایک طوائف تھی۔"

"تمہاری تیسری بیٹی کہاں رہتی ہے؟ مجھے بتاؤ میں اس کے پاس جاؤں گا۔" اعظم نے روتے ہوئے کہا۔

"شاید تم نے اسے دیکھا ہو۔ وہ شاہ صاحب کے گھر میں رہتی ہے۔ وہ دراصل انہی کی بیٹی ہے۔ اس کا نام شافعہ ہے۔ شاہ صاحب نے اسے بچپن سے اب تک مجھ سے نہیں ملنے دیا۔" ربّو کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

اعظم پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ قسمت نے اس کے ساتھ کیسا ہولناک مذاق کیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے ربّو سے کچھ نہیں کہا۔ ربّو زیادہ دیر تک اس کی خاموشی کی متحمل نہیں ہوئی۔ اس نے ایک نظر اعظم کو دیکھا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

اعظم کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی اور اس نے ایک بار ربّو کو سینے سے لگا کر اسے جھلنگے پر ڈال دیا۔

جب وہ ربّو کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو وہاں شافعہ موجود نہ تھی۔ اس کا پلنگ پر شافعہ کا چند سطری خط پڑا ہوا تھا:

"میں اپنے گھر واپس جا رہی ہوں، جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ ایک شریف زادی کا تم سے نباہ مشکل ہے۔"

اعظم نے غصے اور نفرت سے بھنویں سکیڑلیں اور بے دم ہو کر پلنگ پر گر پڑا۔

دوسرے دن صبح تاروں کی چھاؤں میں اس نے سرائے چھوڑ دی۔ اس نے سوچا ایک دن یہاں وہ تنہا آیا تھا اور آج تنہا ہی واپس جا رہا ہے۔ جب اس نے دور مغرب میں اوپر دیکھا تو ستاروں کی چمک سے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے سوچا کہ ایک دن جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کا دل اس چمک، اس سوز سے نا آشنا تھا گویا غریب الوطنی کی ساری کمائی یہی ایک چمک تھی جس میں ایک کیف آ گئیں، سوز اور درد کا ایک بیش بہا خزانہ جگمگا رہا تھا جو کسی کوشش اور جستجو کے بغیر اس کے حصے میں آ گیا تھا۔

آگ کا کھیل

دریائے دجلہ کے مغربی ساحل پر سکندرِ اعظم کے نامور جرنیل سلیوکس نے ایک شہر بسایا، اور اس کا نام اپنے نام کی نسبت سے سلوکیا رکھا۔ یہاں بہت جلد مختلف قومیں آباد ہوگئیں۔ ان میں عربوں اور یہودیوں کی اکثریت تھی۔ جب سلیوکس بھی ماضی کے دوسرے نامی بہادروں کی طرح پیوندِ خاک ہوگیا اور ایران نے اپنا کھویا ہوا وقار ایک بار پھر حاصل کرلیا تو انھوں نے سلیوکیا کے مقابلے میں دجلہ کے مشرقی کنارے پر طیسفون نامی شہر آباد کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آبادی کا جنگل پھیلتا چلا گیا۔ اس شہر کے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے ایرانی بادشاہوں کا دارالحکومت استخر تھا، جو شیراز سے تقریباً پینتیس میل دُور واقع تھا اور یہی وہ شہر ہے، جہاں تاریخ کی عظیم عمارت تختِ جمشید تعمیر کی گئی تھی، لیکن جب طیسفون آباد ہوا تو استخر کی جگہ اس نئے شہر کو دارالخلافے کا اعزاز بخشا گیا۔ یہ شہر آج موجود نہیں کیونکہ بعد میں طیسفون کی جگہ مدائن نے لے لی تھی اور جب مدائن بھی گمنامی میں چلا گیا تو اس کی جگہ ایک تیسرے عظیم الشان شہر بغداد نے لے لی، جو آج بھی موجود ہے۔

جب طیسفون ساسانی حکمرانوں کا دارالخلافہ قرار پایا تو یہاں جگہ جگہ آتش کدے تعمیر ہوئے، اور ان میں ایسی آگ روشن ہوئی جو تقریباً ایک ہزار سال تک فروزاں رہی۔ یہ آتش کدے جو بڑے بڑے رقبے میں پھیلے ہوتے تھے، عبادت گاہ کے علاوہ رہائش گاہ بھی ہوتے تھے۔ ان کے آس پاس موبدوں (پروہتوں) کے خاندان رہتے تھے اور موبدوں کی رہائش گاہوں سے دُور کسی کونے میں ان غریب خدمتگاروں کو بھی رہنے کی جگہیں مل جاتی تھیں جو آتش کدوں اور موبدوں کی خدمت گزاری پر متعین ہوتے تھے۔

دوسرے ملکوں سے جو سفارتیں آتیں، انھیں بھی اِنھی آتش کدوں کے مہمان خانوں میں ٹھہرایا جاتا، اور یہاں کا موبدِ اعظم سُفرا، اور بادشاہ کے درمیان واسطے کا فریضہ انجام دیتا۔ تیسفون سے باہر آیا ہوا کوئی شخص بھی موبدِ اعظم کی مرضی کے بغیر بادشاہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ اُن دنوں باہر سے آنے والوں کی تعداد میں کچھ غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا، اور مہمان خانے تنگ پڑنے لگے تھے۔ چنانچہ موبدِ اعظم نے فیصلہ کیا کہ آتش کدے کی حدود میں اضافہ ناگزیر ہے۔

دجلہ کے دوسرے کنارے پر آباد سلوکیا میں خوش نواز نامی میر عمارت ساز کو موبدِ اعظم کا یہ

فرمان موصول ہُوا کہ "فوراً مذہبی پیشواؤں کے آتش کدے 'آذر فرونگ' میں پہنچ کر موبدِ اعظم سے ملاقات کرے۔"

جب وہ اپنے تمام کام چھوڑ کر دجلہ کے ساحل پر پہنچا تو وہاں ایک لمبی بادبانی کشتی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ موبدِ اعظم کا قاصد نیچا کُرتا اور پائجامہ پہنے، سر پر لمبی ٹوپی اوڑھے سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ کشتی کو ایک رسّی کے ذریعے ساحل پر پڑے ہُوئے بھاری پتھر سے باندھ دیا گیا تھا جب خوش نواز موبدِ اعظم کے قاصد کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گیا تو رسّی کھول کر کشتی کو پانی میں اندر کی طرف دھکیل دیا گیا۔ پہلے تو وہ ادھر اُدھر ہچکولے کھاتی رہی، لیکن جب ملاح اور اُس کے ساتھیوں نے اس کی رفتار پر قابو پا لیا تو خوش نواز کو لے کر تیزی سے مشرقی ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔

اُس دن خوش نواز بہت خوش تھا۔ تقریباً پانچ سال پہلے جب وہ بیس سال کا تھا، اس نے سپاہیوں کے آتش کدے آذر گشسپ کے اندر جلتی ہوئی مقدس آگ کو دیکھا تھا، اور وہیں اس نے اس جہان کے خالق اہوراز مزدا کی وہ مُورت بھی دیکھی تھی، جسے دیبا و حریر کا لباس پہنایا گیا تھا۔ ان دنوں وہ اسی آتش کدے میں توسیع کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ جب کام ختم ہو گیا تو اسے پھر وہاں جانے کی اجازت نہیں مل سکی کیونکہ اُس کا شمار مزدوروں میں ہوتا تھا اور مزدوروں کے لیے علیحدہ آتش کدے تعمیر کیے گئے تھے۔ مزدوروں کے آتش کدوں کو آذر برزین کہا جاتا تھا لیکن آج وہ مذہبی پیشواؤں کے آتش کدہ آذر فرونگ جا رہا تھا۔ اس مقدس آتش کدے کو اندر سے دیکھنے کی اُسے بڑی تمنا تھی۔

کشتی لمحہ بہ لمحہ مشرقی ساحل کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ اُس نے دور ساحل پر نظریں گاڑ دیں، وہاں سرو اور صنوبروں کی چوٹیوں کے اُوپر آتش کدوں کے گنبد صاف نظر آ رہے تھے۔ آتش کدوں کے قبوں پر دیبا و حریر کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ خوش نواز کو ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ لہرا لہرا کر بے چینی سے اسے بلا رہے ہیں۔

آذر فرونگ کے ایک کمرے میں اسے آرام کرنے کی جگہ بھی مل گئی لیکن شام کو وہ دریا پار اپنی بستی میں واپس گیا۔ دوسرے دن صبح مُوبدِ اعظم نے اسے اپنے روبرو طلب کیا اور اسے اپنے ساتھ لے جا کر آتش کدے کا وہ حصہ دکھایا جہاں اب مزید پچاس کمرے تعمیر ہونا تھے۔ آتش کدے کی عبادت گاہ یہاں سے بہت قریب تھی۔ اس نے اُس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور طے کر لیا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر اندر ضرور جائے گا۔ اور مقدس آگ، اہوراز مزدا اور دیگر مورتیوں کی زیارت کرے گا۔ دل میں یہ خواہش برسوں سے پرورش پا رہی تھی۔

تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ تقریباً سو آدمی اُس کی ماتحتی میں عمارت سازی کے مختلف فرائض انجام دے رہے تھے۔ کسی کسی وقت مُوبدِ اعظم آتا اور کام ہوتا ہُوا دیکھ کر واپس چلا جاتا۔ چند دنوں بعد موبدِ اعظم کو اُس پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ وہ کئی کئی دن وہاں نہ آتا۔ خوش نواز نے بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے موبدِ اعظم کو

بہت مطمئن کر دیا تھا۔ وہ صبح، دوپہر، سہ پہر، شام اور رات کو پانچ بار معبد میں آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا تھا، لیکن ان آنے والوں میں ایک عورت ایسی بھی تھی، جو ہر دوسرے تیسرے دن ایسے وقت میں معبد جاتی جب اندر کوئی نہ ہوتا۔ وہ سر سے پیر تک سفید چادر میں لپٹی ہوتی تھی اور پورا جسم اتنی بُری طرح چادر میں چھپا ہوتا کہ اس کے لیے یہ تمیز کرنا دشوار تھا کہ یہ عورت کس عمر یا کیسی صورت شکل کی ہے۔

ابھی دوپہر ہونے میں دو ساعتیں باقی تھیں کہ وہی عورت ڈری سہمی ایک طرف سے نمودار ہوئی اور چپ چاپ عبادت گاہ میں داخل ہو گئی۔ خوش نواز بھی کسی جھجک یا خوف کے بغیر غیر ارادی طور پر اس عورت کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ عورت اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کچھ سوچتی ہوئی بوجھل قدموں سے حجرۂ نار کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ ذرا سی دیر کے لیے خوش نواز نے سوچا کہ اگر اس نے پلٹ کر اُسے دیکھ لیا تو معلوم نہیں اس پر کیسا عتاب نازل ہو۔ اس کے جی میں آئی کہ اب وہ اس عورت کا مزید تعاقب نہ کرے اور باہر واپس جائے، لیکن جذبۂ تجسس نے اسے روکے رکھا، وہ عورت حجرۂ نار میں داخل ہو گئی۔

خوش نواز اس حجرے کے باہر ہی رہا۔ کئی بار اندر جانے کی ہمت کی لیکن حوصلہ نہ پڑ سکا۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر پہنچا بھی نہ تھا کہ اندر سے نہایت دل کش اور ترنم سے لبریز سوگوار آواز اسے سنائی دی۔ آواز سے اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ یکایک مشتعلگی رومی اور صندل کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی۔ خوش نواز سمجھ گیا کہ یہ خوشبوئیں لڑکی جلا رہی ہے۔

اسی لمحے اندر سے لڑکی کے گڑگڑانے اور مناجات کرنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لڑکی بہت غمزدہ اور دُکھیاری ہے۔ وہ کہہ رہی تھی:

"اے آذرخش! (مقدس آگ) تو نرسی پر رحم فرما۔ وہ مزدک کے دین میں داخل ہو گیا ہے۔ میں تیری پرستار گنہگار یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ مجھے چھوڑ کر ایک ایسے نوجوان کی محبت کا دم بھروں جو بردین (زرتشتیت) کو چھوڑ کر مزدک کے دین میں شامل ہو جائے۔

اے اہورامزدا! یہ کیا قیامت ہے کہ نرسی یہ کہتا پھرتا ہے کہ تمام عورتیں تمام مردوں کی مشترکہ ملکیت ہیں اور تمام مرد تمام عورتوں کا حق ہیں۔ وہ مجھے بے حیائی اور بے غیرتی پر مجبور کرتا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ کہتا ہے کہ محبت کوئی چیز نہیں۔ اے یزداں! تو مجھے یہ توفیق عطا فرما کہ میں اپنے دل سے نرسی کی محبت نکال پھینکوں یا پھر نرسی کے دل کو پھیر دے اور وہ پھر اپنے دین میں واپس آ جائے!"

خوش نواز ذرا ہمت کر کے اور آگے بڑھا، آتش کدے میں باہر کی روشنی کو پہنچنے سے روک دیا گیا تھا۔

اندر کی فضا آتش کدے کی آگ سے روشن تھی۔ جب وہ ہمت کر کے آتش کدے میں داخل ہو رہا تھا تو اس پر کئی احساسات غالب آ گئے۔ آگ کی سرخ روشنی میں لڑکی کا چہرہ تمتا رہا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو رومال میں چھپا رکھا تھا، رخساروں پر آنسوؤں کے قطرات ڈھلک آئے تھے اور وہ آگ کی چمک میں جھلملا رہے تھے۔ لڑکی سر تا پا سفید لباس میں چھپی ہوئی تھی، کھلا ہوا چہرہ کسی حور کی طرح معصوم دکھائی دے رہا تھا۔ اندر آگ کی گرمی سے جسم کے مسام کھل گئے اور ان میں سے پسینہ رسنے لگا۔ مصطگی رومی اور صندل کی خوشبو نے دل میں ایک عجیب سی تحریک پیدا کر دی، ایسی تحریک جس کے زیرِ اثر انسان عبادت پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یکایک لڑکی کچھ آہٹ محسوس کر کے گھوم گئی اور اپنے پیچھے ایک اجنبی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر دریافت کیا: "تم کون ہو؟ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

خوش نواز بھی بوکھلا گیا، اس نے جواب دینے کے لیے کئی بار منہ کھولا لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مؤبدِ اعظم اس کے روبرو کھڑا دریافت کر رہا ہے کہ "اے خوش نواز! جب تو یہ جانتا ہے کہ مذہبی پیشواؤں کے اس آتش کدے میں کسی دوسرے طبقے کا آدمی نہیں داخل ہو سکتا تو تیری یہ کس طرح ہمت پڑی کہ تو جو محض معمار ہے، کیوں اس معبد میں داخل ہو گیا؟" پھر اس نے محسوس کیا جیسے مؤبدِ اعظم اپنی کڑک دار آواز میں سوال کر رہا ہے: "بول! تجھے تیرے اس گناہ کی کیا سزا دی جائے؟"

لڑکی نے جلدی سے اپنی چادر اوڑھ لی اور حجرۂ نار سے باہر نکلنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی خوش نواز کے پاس سے گزری۔ اس کے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لیے رکی اور خوش نواز کو مخاطب کیا: "اے اجنبی نوجوان! گو میں نے تمہیں یہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم ان راج معماروں میں شامل ہو جو ان دنوں آتش کدے میں توسیع کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔"

خوش نواز نے ڈرے سہمے لہجے میں جواب دیا: "بے شک میں معمار ہوں لیکن معمار ہونا کوئی جرم تو نہیں ہے۔"

لڑکی نے ناخوشگواری سے کہا: "تم معمار ہو اور تمہیں مذہبی پیشواؤں کے آتش کدے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

خوش نواز ڈرا کہ یہ لڑکی ضرور اس کی چغلی کھائے گی اور اسے جرم کی فرد کوئی بدترین سزا دی جائے گی۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ لڑکی کے باہر نکلنے سے پہلے اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا: "معزز خاتون! میں غلطی سے یہاں آ گیا تھا جس کی میں معافی چاہتا ہوں!" اس کے بعد وہ باہر جاتا ہوا بولا، "میں اسی

رات یہاں سے چلا جاتا ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی کوئی بھی خدمت بجا لا سکتا ہوں!" یہ کہتے کہتے اس نے مڑ کر گہری نظروں سے لڑکی کو دیکھا، چادر کے اندر سے اس کا افسردہ چہرہ اس طرح جھانک رہا تھا جس طرح روئی کے گالے جیسے بادل سے چاند جھانکتا ہے۔

لڑکی نے اُداسی سے کہا، "تم میری کیا خدمت کر سکتے ہو؟"

خوش نواز کے قدم سست پڑ گئے، رک کر بولا، "آپ جو خدمت بھی چاہیں، میں کرنے کو تیار ہوں۔"

لڑکی نے ذرا بے رُخی سے کہا، "تمہیں یہ کیسے اندازہ ہُوا کہ میں کسی کی مدد کی متمنی ہوں؟"

خوش نواز دل ہی دل میں خوش ہو گیا کہ وہ حسین لڑکی اس کی باتوں میں آ چکی ہے۔ اس کے دل میں راہ پیدا ہو گئی ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا، "معزز خاتون! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو یونان کی ناہید دیوی سے تشبیہ دوں۔ آپ کے چہرے کی ایک جھلک میں، میں نے جو معصومیت اور کشش محسوس کی ہے، وہ انسان کو حسینۂ فلک ناہید کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتی۔ مجھے اپنے کمتر درجے کا بھی احساس ہے۔ میں معمار ہوں، جس کا کسی موبد یا ہیربد کے خانوادے کی دوشیزہ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن انسانی ہمدردی اور جذبۂ نیکی نے مجھ میں اتنی جرأت پیدا کر دی ہے کہ میں نے آپ کا پیچھا کیا، پیشواؤں کے آتش کدے میں داخل ہُوا اور آخر آپ کی خواہش اور مرضی کے خلاف آپ کو مخاطب کیا۔ یہ سارے ہی جرائم ایسے ہیں کہ میں کسی عبرتناک سزا کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہوں۔"

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، "تم بہت باتونی معلوم ہوتے ہو۔" اس کے بعد وہ ایک طرف چل دی اور جاتے جاتے کہتی گئی، "تم خوش قسمت ہو کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔"

خوش نواز دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور لڑکی چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے اس وقت تک برابر دیکھتا رہا، جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ ہیربدوں کے مکانات میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ اسے جہاں اس بات کا ملال تھا کہ وہ لڑکی کی بابت تفصیل سے کچھ بھی نہ جان سکا، وہاں یہ خوشی بھی تھی کہ لڑکی اس سے ناراض ہو کر نہیں گئی تھی اور یہ کہ اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ لڑکی ہیربدوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، ہیربد جو موبدوں سے کمتر اور ان کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ مفکرانہ قدم اٹھاتا ہُوا اس طرف چل دیا جہاں بہت سے مزدور پتھروں اور مسالوں کی مدد سے دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔ جب وہ آتش کدے کی حدود سے نکل چکا تھا تو اس نے موبد اعظم اور اس کے کئی پرستاروں کو آتش کدے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ دودھ کی طرح سفید کپڑے پہنے اور سر پر سفید ٹوپی رکھے وہ اپنے پرستاروں کے درمیان اس رعونت سے جا رہا تھا کہ خوش نواز کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش پیدا ہو گئی۔

خوش نواز معاشرے میں جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہ نہایت حقیر اور کمتر تصور کیا جاتا تھا اور ملک میں سب سے معزز اور مقدس صرف موبد ہی مانے جاتے تھے۔ اس نے سوچا کہ اے کاش وہ کسی موبد یا ہیر بد کے گھرانے میں پیدا ہُوا ہوتا جہاں لوگوں کی بڑی عزت ہوتی ہے، جن کے عزت و احترام کے پیش نظر لوگ، ان کے ساتھ چلتے ہوئے دو قدم پیچھے رہ کر چلتے ہیں، موبد اعظم فرشتوں کی طرح پر تولتا ہُوا آتش کدے میں داخل ہوگیا۔ خوش نواز کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوکر معمول پر آگئی اگر اس وقت وہ آتش کدے میں موجود ہوتا اور اس کی موجودگی میں موبد اعظم اندر داخل ہو جاتا تو اس کا بہت بُرا حشر ہوتا۔ اس حشر کے تصور ہی سے وہ کانپ گیا۔ لیکن اسی لمحے پھر اس خواہش نے جنم لیا کہ اے کاش وہ موبد ہوتا۔

اے کاش وہ موبد گھرانے کا ایک فرد ہوتا! لیکن اس عہد میں اس کی قطعاً گنجائش نہ تھی کہ کوئی انسان پیدا تو ہو کسی ادنیٰ طبقے میں اور داخل ہو جائے کسی دوسرے طبقے میں۔ یہاں تو ایک ہی نظام صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا کہ انسان جس طبقے میں پیدا ہوگا، اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اسی طبقے میں لے گا۔ ہاں ایک جابر طریقہ بھی معاشرے میں موجود تھا جس پر چل کر کسی کمتر درجے کا کوئی فرد اپنے سے اعلیٰ طبقے میں داخل ہوسکتا تھا لیکن یہ طریقہ بہت ہی دشوار گزار تھا۔ ایسے امید وار کو کسی کٹھن آزمائش سے گزر کر یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے زندگی کا خطرناک ترین کام بھی انجام دے سکتا ہے، لیکن جب وہ اس امتحان میں کامیاب ہوکر کسی اعلیٰ طبقے میں داخل ہوتا تو وہ کئی پشتوں تک یہ محسوس کرتا رہتا کہ یوں تو اُسے طبقاتی اعزاز حاصل ہوگیا ہے لیکن عملاً معاشرے کے معززین نے اسے قبول نہیں کیا ہے اور یہ بات بڑی سوہانِ روح ہو جاتی۔

ہر روز صبح جب خوش نواز بادبانی کشتی پر سوار سلوکیا سے طیسفون کی طرف جا رہا ہوتا اور صبح کے پرند اپنے چہچہوں سے دلوں میں کیف و سرور پیدا کر رہے ہوتے تو خوش نواز کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی۔ بلبل کی زمزمہ سنجی سے اس پر دیوانگی کا تاثر طاری ہو جاتا۔ وہ دن بھر اپنے کام کی نگرانی کرتا رہتا اور جب بھی موقع ملتا حسرت سے آتش کدے کے اس حصے پر نظریں ڈالتا جہاں کچھ دنوں پہلے اتفاقاً سے گلنار سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ پھر وہ ہیر بدوں کے مکانات پر نظریں ڈالتا جہاں وہ گم ہوگئی تھی عجیب اتفاق کی بات تھی کہ اس کے بعد گلنار ادھر نہیں آئی۔ وہ سوچتا کہ شاید گلنار اس سے ناراض ہوگئی ہے۔ یوں تو بات کچھ بھی نہ تھی، خوش نواز اور ہیر بدوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، پھر بھی وہ گلنار کا انتظار کرتا رہتا۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ گلنار دوبارہ اسے مل بھی گئی تو وہ کس کام کی۔ ان مایوسی آمیز خیالات کے باوجود دل کے کسی گوشے میں امید کی کرن بھی موجود تھی، جو کسی دلیل کے بغیر ہی جھلملا رہی تھی۔ اسی طرح دو ہفتے

گزر گئے۔ تعمیر کا کام تیزی سے نپٹتا جا رہا تھا۔

دوسری طرف گلنار بھی کچھ کم پریشان نہیں تھی۔ وہ موبدِ اعظم کے نائب ہیربدِ ذیستان کی بیٹی تھی۔ گلنار بچپن ہی سے اپنے چچا کے لڑکے نرسی کو بہت چاہتی تھی اور ان دونوں کی نسبت بھی طے پا چکی تھی لیکن نرسی جیسے جیسے جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگا، اس کے خیالات باغیانہ اور ملحدانہ ہونے لگے۔ اسے اپنا آبائی کام بالکل پسند نہ تھا۔ اصولاً اسے بھی ہیربد بننا چاہیئے تھا جن کے ذمے آتش کدوں کی دیکھ بھال اور آگ فروزاں رکھنے کا کام ہوتا تھا لیکن نرسی کو اپنا آبائی کام نفرت کی حد تک ناپسند تھا۔ وہ سپاہی بننا چاہتا تھا لیکن معاشرے کی طبقاتی قیود اور پابندیاں بُری طرح آڑے آئی تھی۔ نرسی کی خوش قسمتی کہ ان دنوں تختِ جمشید سے مزدک نامی ایک ایسا انقلابی فیلسوف سے وارد ہو چکا تھا جو موجودہ معاشرتی ڈھانچے میں زبردست تبدیلیاں لانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ وہ اس طبقاتی تقسیم پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لوگوں کو ایسی باتیں بتائیں جو اس سے پہلے کسی اور نے نہیں بتائی تھیں۔ تقریباً دو ماہ پہلے گلنار، نرسی کے ہمراہ تیسفون کے مشہور بازار نوخیزی سے گزر رہی تھی۔ اس وقت وہ دو گھوڑوں کی رتھ پر سوار تھی، نرسی اس کے داہنی طرف بیٹھا پر لطف باتیں کر رہا تھا کہ نوخیزی کے چوراہے پر اس نے ایک بہت بڑے مجمع کو دیکھا۔ مجمع کے اندر کسی کے جوش و خروش سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اپنی رتھ کو قریب لے جا کر ایک طرف کھڑا کر دیا اور گلنار سے کہا، ”گلنار تم اس رتھ میں موجود رہو، میں ابھی آتا ہوں، دیکھتا ہوں یہ کون ہے جس نے اپنے گرد اتنا بڑا مجمع اکٹھا کر لیا ہے۔“

گلنار چپ چاپ بیٹھی رہی، نرسی بے نیازی سے مجمع کے اندر داخل ہو گیا۔

دور سے گلنار اور تو کچھ سن نہیں سکی لیکن جن باتوں نے اسے چونکا دیا تھا وہ جس دل میں دل ہی دل میں اترتی چلی گئیں، کسی بوڑھے کی آواز طوفانی بادل کی گرج کی طرح سنائی دے رہی تھیں،

”اے کسانو اور محنت کرنے والو! جس طرح بارش، ہوا، دھوپ اور چراگاہیں انسانوں کے لیے ایسے فیض رساں یزدانی ہیں جن میں امیر غریب کے لیے کوئی تخصیص نہیں، یہ سب کے لیے یکساں اور عام ہیں اسی طرح دنیا میں جو نعمتیں بھی ہیں سب کے لیے ہیں اور کسی انسان کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ نعمتوں کے ذخائر پر سانپ کی طرح بیٹھ کر چوکیداری کرے۔ یہاں تک کہ بادشاہ قباد کو بھی۔ قباد کی دولت میں سب کا حصہ ہے، امراء کی دولت میں بھی سبھی شریک اور حصے دار ہیں۔“

یکایک تحسین و مسرت کے نعرے اتنے زور و شور سے بلند ہوئے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ گلنار کو جس بات نے سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ اس مجمع میں عورتوں اور مردوں کا بے تکلفی سے یکجا ہو جانا تھا، اُسے

غیرت تھی کہ جس معاشرے میں عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا رواج ہو وہاں شارعِ عام پر ایک دوسرے کا دوش بدوش کھڑا ہونا کتنا عجیب تھا۔

جب لوگوں کا جوش و خروش کچھ کم ہوا تو وہی بوڑھی آواز پھر سنائی دی:

"لوگو! دنیا میں فساد کی جڑ دو چیزیں ہیں، عورت اور دولت۔ جس طرح پانی، ہوا اور دھوپ میں سب شریک ہیں اسی طرح مال میں بھی سب شریک ہیں اور کوئی عورت بھی کسی خاص آدمی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ لوگو یہ کیسا ظلم ہے کہ ایک شخص کی عورت تو بہت حسین ہو اور دوسرے کی انتہائی بدصورت۔ ایسی صورت میں شرطِ دین داری یہ ہے کہ تم اپنی عورتوں کو آپس میں بدلتے رہو تاکہ مساوات قائم رہے۔ لوگو! کیسا اندھیر ہے کہ ایک آدمی کے پاس تو بہت سا مال و منال ہو اور وہ خوب عیش کرتا رہے اور دوسرا قلّاش ہو اور فاقے کرتا رہے۔ چنانچہ شرطِ دین داری یہ ہے کہ متمول آدمی اپنے مال کو غرباء میں تقسیم کر دے تاکہ سب مساوی ہو جائیں اور جو شخص اس طریقِ تقسیم اور مساوات پر راضی نہ ہو وہ اہرمنی ہے، شیطان کی ذریات میں سے ہے۔"

ایک بار پھر شور و غل بلند ہوا اور مارے خوشی کے مجمع آپس میں بغل گیر ہو گیا۔ عورتوں اور مردوں میں جنس کے آداب اور تکلفات کا احساس تک باقی نہ رہا۔ دونوں ہی ایک دوسرے میں پیوست ہونے لگے۔ بر سرِ عام بوس و کنار کے مناظر گلنار کے دل میں آگ سی لگانے لگے۔ سامنے جو ہنگامہ برپا تھا، گلنار میں اتنی تاب نہ تھی کہ اس کا اچھی طرح مشاہدہ کر سکتی۔ اس نے جتنا کچھ بھی دیکھا اس میں حیرت کی ایک بات نمایاں تھی کہ کئی بدصورت عورتوں کو خوبصورت مردوں کو اور بدصورت مردوں کو حسین عورتوں نے اپنی اپنی آغوش میں لے رکھا تھا اور دونوں نہایت دیانت داری سے مساوات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ گلنار کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں یہ لوگ اس کی رتھ کی طرف نہ آ جائیں اور اس پر بھی ہاتھ ڈال دیں، وہ بے چینی سے اس مجمع میں اپنے منگیتر نرسی کو تلاش کرنے لگی لیکن وہ کوشش کے بعد کہیں نظر نہ آیا۔ ابھی تک اس نے اپنے کوچوان کی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ گلنار نے گھبرا کر اسے حکم دیا، "کوچوان! نیچے اترو اور فوراً نرسی کو تلاش کر کے ساتھ لاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ پاگل مجھے آ کر تنگ نہ کریں۔"

کوچوان تو جیسے اس حکم کا منتظر ہی بیٹھا تھا، فوراً رتھ سے کودا اور بھاگ کر مجمع میں شامل ہو گیا اور پھر اس میں وہ کدھر گم ہو گیا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب گلنار کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

اچانک ایک طرف سے نرسی نمودار ہوا لیکن اب وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک نہایت حسین لڑکی اس کی آغوش میں تھی۔ اور وہ اسے خوب بھینچ بھینچ کر پیار کر رہا تھا۔ لڑکی نے بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے بھی اپنے

دونوں ہاتھوں سے کانوں سے اوپر نرسی کے سر کو پکڑ رکھا تھا اور لب و رخسار، تھوڑی اور پیشانی کے بوسے لے رہی تھی۔ گلنار کو ایسا محسوس ہوا جیسے سامنے کی ہر شئے تیزی سے گردش کرنے لگی ہے اور آنکھوں کی بینائی آہستہ آہستہ زائل ہوتی جارہی ہے اور پھر اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کس طرح ایک طرف ڈھلک گئی تھی لیکن جب وہ ہوش میں آئی تو وہ سارے مناظر خواب و خیال کی طرح محو ہو گئے تھے، وہ تھا، نرسی تھا اور اس کا کوچوان تھا۔ رتھ آتشکدے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا اور وہاں کی پوری فضا عود و صندل کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی۔ اب رتھ آہستہ آہستہ پیر ہدوں کے مکانات کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب رتھ گلنار کے مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تو نرسی پھرتی سے نیچے اتر گیا اور پھر ہاتھوں کا سہارا دے کر گلنار کو نیچے اتارا۔ گلنار کو بڑی نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ دل بجھ سا گیا تھا۔ اعصاب میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی، کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خالی رتھ کو کوچوان آگے لیے چلا گیا۔ اس وقت آس پاس بالکل سناٹا تھا۔

نرسی نے کمزور اور اداس گلنار کو سامنے کے سبزے کی طرف لے جانا چاہا جہاں سبزے کے علاوہ لالہ و گلاب اور سرو و یاسمن بھی موجود تھے۔ گلنار نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ اب کہاں اور کیوں لیے جارہا ہے۔

نرسی اسے لالہ و سرو کے جھنڈ میں لے کر بیٹھ گیا۔ گلنار نے اپنی پشت سرو کے تنے سے ٹکا دی۔

نرسی نے گلنار کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بوسہ دے کر چھوڑ دیا۔ بولا: "گلنار! کیا بات ہے، تم پریشان کیوں ہو گئیں؟"

گلنار کے سینے میں رقابت اور حسد کی بھٹی سلگ رہی تھی، نرسی کے سوال نے اسے آگ بگولا کر دیا۔ ناخوشگوار لہجے میں بولی "تم میری پریشانی کی وجہ پوچھتے ہو؟ میں بتاؤں اپنی پریشانی کی وجہ؟"

نرسی نے اسے اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی، "ضرور بتاؤ!"

گلنار نے اسے پیچھے دھکیل دیا، بے قابو ہو کر بولی: "کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے سوا کسی اور کی آغوش میں چلی جاؤں؟ کیا تم مجھے بھی .... اسی حالت میں دیکھنا گوارا کر سکتے ہو جس میں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں تمہیں دیکھ چکی ہوں؟"

نرسی بے اختیار زور زور سے ہنسنے لگا، گلنار اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے نرسی کا دماغ چل گیا ہو۔ نرسی نے گلنار کی بات کا کوئی اثر ہی نہ لیا، کہنے لگا "تم نے بڑا اچھا کیا گلنار کہ ایک ایسے موضوع پر گفتگو کا آغاز کر دیا جس پر میں خود بھی بات کرنے والا تھا لیکن کوئی مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔"

گلنار نے اس دوران پہلی بار نرسی کو بغور دیکھا۔ اس نے دیکھا اب نرسی کے چہرے پر سنجیدگی ہی سنجیدگی

تھی۔ ساری شوخی اور مسکراہٹ دور ہو چکی تھی۔ گلنار اس کی صورت اس طرح دیکھ رہی تھی گویا کہہ رہی ہو "کہو کیا کہتے ہو۔"
نرسی نے دور افق پر نظریں گاڑ دیں اور کہنے لگا "گلنار! کیا تم نے اس عظیم انسان کی باتیں سنیں، جس کی باتیں سننے میں تمہیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا؟"

"ہاں!" گلنار نے کہا۔ "تم اس خبیث کو عظیم انسان کہتے ہو؟"

بات ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ نرسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور غصے سے بولا "گلنار تم اس عظیم بزرگ کو ناشائستہ الفاظ سے نہیں یاد کر سکتیں۔ پہلے تم اپنا لہجہ درست کرو پھر میں کوئی بات کروں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ گلنار اس کی بابت کچھ جاننا چاہتی تھی، چپ ہو گئی۔ آہستہ سے بس اتنا کہا۔

"اچھا اس کی بابت تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہہ لو، مجھے جو کچھ کہنا ہے بعد میں کہوں گی۔"

نرسی نے اسی برافروختہ لہجے میں کہا "تمہیں کچھ کہنے سننے سے تو میں منع نہیں کر سکتا لیکن اس کا ضرور خیال رکھنا کہ میں اس بزرگ انسان کی شان میں کسی بھی شخص کے ناشائستہ الفاظ ہرگز نہیں برداشت کر سکتا۔"

گلنار نے کوئی جواب نہ دیا۔ گویا یہ اس بات کا اقرار تھا کہ وہ آئندہ محتاط رہے گی۔

نرسی کہنے لگا "وہ کہتا ہے ذاتی املاک کا تصور ہی فساد کی جڑ ہے، یہ عورت میری ہے، یہ دولت میری ہے۔ یہ ساری فساد کی باتیں ہیں۔ مزدک کہتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہے سب انسانوں کا ہے، اونچ نیچ کی حد بندیوں کو توڑ دو، تفرقے اور امتیاز کی دیواریں گرا دو، مزدک دین فطرت لے کر آیا ہے۔" اور اس کے بعد آہستہ سے کہا "گلنار! میں نے یہ نیا دین قبول کر لیا ہے، اب میں مزدکی ہو گیا ہوں۔"

گلنار کے پیروں تلے سے زمین نکلنے لگی۔ "نرسی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو نرسی؟ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے کہ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے اور کس طرح نہیں ہو سکتا۔ یہ ساری باتیں سوچنا جس کا کام ہے وہ خوب سوچ رہا ہے۔"

گلنار نے بیزار ہو کر دریافت کیا "تم مجھے یہاں کس لیے لائے ہو؟"

"باتیں کرنے۔"

"تب پھر کرو باتیں۔"

"یہ ایک الگ بحث ہے!"

"نہیں پہلے تم مجھے یہ یقین دلا دو کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔"

گلنار نے جواب دیا "میری ناراضی اور رضامندی کا فیصلہ اس وقت ہو گا جب میں تم سے تمہاری ساری باتیں سن لوں گی۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

نرسی کہنے لگا: "خیر، تو سنو گلنار! میں مزدکی ہو گیا ہوں۔ مزدک یزداں کا پیغمبر ہے اور وہ ہم میں اس لیے آیا ہے کہ نور کو ظلمت سے دور کرے۔ وہ غریبوں اور ناداروں کا غمخوار ہے۔ وہ امراء اور دولت مندوں کا دشمن ہے۔ اس کی وہی تعلیمات ہیں جو زرتشت یا مانی پیغمبر کی تھیں۔ بس اس میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ انفرادی اور ذاتی ملکیت کے تصور کو ختم کر دیا جائے۔" اس کے بعد وہ تصور ہی تصور میں مزدک کی تعلیمات کے لطیف اور لذیذ پہلوؤں پر غور کر کے سرور اور کیف حاصل کرنے لگا۔ "وہ کہتا ہے، یہ دنیا حادثے کی طرح اتفاق سے وجود میں آگئی ہے۔ شروع شروع میں نور اور ظلمت الگ الگ تھے لیکن بعد میں یہ دونوں چیزیں اتفاق سے ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں۔ مزدک کہتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور آئے گا کہ یہ دونوں چیزیں پھر الگ الگ ہو جائیں گی۔ بس ہمیں اسی مبارک گھڑی کا انتظار ہے۔"

گلنار نے کہا: "یہ میں کچھ نہیں جانتی لیکن اسے یہ حق کس یزداں نے دیا ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں سے محرمات اٹھا دے؟"

"خدا نے، یزداں نے، اہورامزدا نے۔" نرسی نے جواب دیا۔ "آخر اس میں حرج یا شرم کی کیا بات ہے؟"

گلنار نے حیرت سے کہا: "تو گویا تم بھی یہ کہتے ہو کہ اس میں حرج یا شرم کی کوئی بات نہیں؟"

"بالکل۔" نرسی نے کہا "اور میں ہی کیا لاکھوں افراد یہی سمجھنے لگے ہیں اور اس میں کوئی شرم یا قباحت محسوس نہیں کرتے۔"

گلنار نے دل برداشتہ ہو کر کہا، "تمہاری عقل یا غیرت کو کیا ہو گیا ہے نرسی؟ یعنی میں، جس سے تم محبت کرتے ہو، جس سے تمہاری شادی ہونے والی ہے، اگر صرف تمہاری نہ رہوں، سب کی ہو جاؤں تو تمہیں کوئی شرم یا عار نہیں محسوس ہو گا؟"

نرسی نے جواب دیا: "ہاں مجھے کوئی شرم یا عار محسوس نہیں ہو گا، اور اس لیے محسوس نہیں ہو گا کہ ہمارا پورا معاشرہ یہی ہو گا اور اس میں کوئی کسی سے شرمندہ نہ ہو گا۔"

گلنار نے کہا "میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔"

"تمہاری عقل چھوٹی ہے جس میں ابھی یہ باتیں نہیں سمائیں گی۔ لیکن جب پورا معاشرہ اس رنگ میں رنگ جائے گا تو میرا خیال ہے کہ تم اپنے موجودہ معاشرے اور اخلاقی نظام پر ہنسو گی اور نئے معاشرے سے ایسی خوشیاں اور لطف و لذت حاصل کر سکو گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

گلنار نے قطعی فیصلہ دے دیا: "لیکن میں اس معاشرے یا نظام کو کسی قیمت پر بھی قبول نہ کروں گی کچھ بھی ہو جائے، چاہے جان ہی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔"

نرسی، گلنار کی انتہا پسندی اور رجعت پرستی پر مسکرایا، بولا "اپنے آبا و اجداد کی رسوم اور چلن چھوڑنا اور نئے رسوم اور آئین اختیار کرنا بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔ آدمی کی بڑائی اور برتری کا اسی بات سے اندازہ ہو جاتا ہے۔" پھر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر گلنار کو سبزے پر گرا دیا اور اس کے برابر ہی خود بھی لیٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہے تھے۔ نرسی نے اس کے شانوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر ذرا اور اپنی طرف کھسکا لیا۔ آنکھوں میں سرشاری آگئی اور پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ گلنار کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ نرسی نے اس کی ٹھوڑی کا بوسہ لے لیا، کہنے لگا "گلنار! کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو؟" دل کدورتوں سے پاک اور نشۂ محبت میں آلودہ آواز میں جواب ملا: "ہاں، مگر تمہیں اس کی تصدیق کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟" کہتے کہتے گلنار بالکل اس کے سینے میں دبک گئی۔

"کیا تم اس پر آمادہ ہو کہ میں تمہاری محبت کا امتحان لوں؟"

"ہاں، میں تیار ہوں، جب چاہو۔"

"اِس وقت بھی؟"

"ہاں، اس وقت بھی!"

"خوب سوچ لو!" نرسی نے اس کے چہرے پر آجانے والی لٹوں کو ہٹایا تو محسوس ہوا جیسے بدلی سے چاند نکل آیا ہو۔

گلنار نے جواب دیا: "خوب سوچ لیا۔"

نرسی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا: "تم مکر جاؤ گی، اپنی بات سے پھر جاؤ گی۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہو گا۔" گلنار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں "تم مجھے اب تک نہیں سمجھے نرسی!"

نرسی نے کہا "اگر یہ بات ہے تو ابھی میں تمہیں سمجھے لیتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے تو تمہیں سمجھ لیا ہے لیکن تم خود مجھے نہیں سمجھ سکی ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" گلنار نے اپنے جسم کو کچھ اُوپر اٹھایا اور نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی کنکری کو اٹھا لیا اور اُسے دُور پھینکتی ہوئی بولی "دیر سے چبھ رہی تھی یہ۔"

نرسی نے کہا "اس کنکری کی طرح ایک شبہ میرے دل میں بھی چبھ رہا ہے۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "تمہیں مجھ پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں، تم پر نہیں، تمہارے خیالات، تمہارے عقائد اور تمہارے ارادوں کی قوت پر شبہ کر رہا ہوں گلنار"

گلنار نے اسے مسکرا کر دیکھا اور شوخی سے مسکرا کر سر جھکا کر نرسی کے سینے کے بالوں کو دیکھنے لگی۔

نرسی نے اس کے لب و رخسار پر بوسوں کی بارش کر دی اور پوری قوت سے بھینچ کر اس کے جسم کی ہڈیاں

بیٹھا دیں۔ جب گلنار خود بھی بے قابو، مست اور بے خود سی ہو گئی تو نرسی نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ بولا "گلنار! تمہیں میری خاطر مزدکیت قبول کرنا پڑے گی۔"

گلنار کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بیزاری سے کسمسا کسمسا کر آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے نرسی کو پیچھے دھکیل دیا اور بیزار آواز میں بولی "ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے چھوڑ دو۔"

نرسی نے اپنی گرفت اور زیادہ سخت کر دی: "تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔"

گلنار نے غصے میں کہا "میری بات کا تم جو مطلب بھی چاہو، لو لیکن میں بہ دین (زرتشتی مذہب) نہیں چھوڑ سکتی اور مزدکیت نہیں قبول کر سکتی۔"

"احمق!" نرسی نے محبت سے کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ بہ دین کی زندگی خشک اور بے کیف زندگی ہے یہاں امیروں اور غریبوں کے طبقات ہیں، یہاں بادشاہ ہے جو مختارِ مطلق ہے، شہزادے ہیں جو سب سے زیادہ آزاد خوش حال اور بالادست ہیں۔ عورتیں ہیں جن پر ایسے لوگوں کو حقِ تصرف حاصل ہے جنہیں عورتیں نہیں چاہتیں، مرد ہیں جو اپنی ناپسند عورتوں کو نہیں چاہتے لیکن ان کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ کیا تمہیں ایسا ماحول پسند ہے؟ (ایسا) دین اور ایسا نظامِ حیات پسند ہے؟"

گلنار کے پاس ان باتوں کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ نرسی یہ سمجھا کہ وہ شاید قائل ہوتی جا رہی ہے، اُس نے اپنی تقریر کو جاری رکھا: "اور پھر یہ فطری بات نہیں ہے کیا آدمی ایک ہی ماحول اور ہر وقت سامنے رہنے والی شخصیات سے بیزار نہیں ہو جاتا؟ — آدمی تبدیلیاں چاہتا ہے اس کی پسند بدلتی رہتی ہے، کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تم لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر خواہشات اور چاہتوں میں ناکام اور نامراد رہو؟"

لیکن اس کی تمام دلیلیں گلنار کو مطمئن نہ کر سکیں۔ وہ یہی کہتی رہی کہ "میں مر جاؤں گی لیکن مزدکیت قبول نہ کروں گی۔"

خلافِ توقع نرسی نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی، اسے چھوڑ دیا اور بولا "تب پھر ہم دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ تم بشوق اپنے بہ دین پر قائم رہو اور میں مزدکیت نہیں چھوڑ سکتا۔"

گلنار اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کپڑوں کو جھاڑتی ہوئی بولی: "اور میں ہی کیا، گھر کا ایک فرد بھی اس پر تیار نہ ہو گا کہ میں مزدکیت اختیار کر لوں۔"

نرسی کو پھر امید ہوئی کہ شاید گلنار مزدکیت قبول کر لے اور اس کا انکار محض خاندانی اور مذہبی روایات کے خلاف حوصلۂ بغاوت کے نہ ہونے کے سبب سے ہے۔

اس نے گلنار کی ہمت بڑھائی، بولا "تم صرف ہاں کہہ دو۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو گا اس کا ذمہ دار میں ہوں۔"

گلنار نے کہا "میں کس طرح اس لغو اور ذلیل دین کے لیے ہاں کر سکتی ہوں؟"
نرسی کا چہرہ سرخ ہو گیا، درشت لہجے میں بولا: "لغو اور ذلیل دین تمہارا ہے یا میرا؟ تمہارا ہی دین تو ہے جس میں انسان کو یہ آزادی بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے خاندانی پیشوں سے نکل کر اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرے۔ تمہارے ہاں آدمی جس طبقے میں پیدا ہوا ہے، مر کر بھی اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ تمہارے دین نے انسانوں کو طبقات اور ذاتوں میں بانٹ دیا ہے اور یہ سب فطرت کے خلاف ہے اور جو فطرت کے خلاف ہے اسے جلد یا بدیر ختم ہونا ہے۔ تمہارا یہ دین بھی عنقریب موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔"
گلنار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اس کے ساتھ ہی میں بھی موت کے گھاٹ اتر جاؤں گی لیکن مزدکیت قبول نہیں کروں گی۔"
"تمہاری مرضی!" نرسی اس طرح اس سے الگ ہوا گویا اس کی کبھی گلنار سے کوئی جان پہچان ہی نہ تھی وہ اسے تنہا چھوڑ کر ایک طرف چلا گیا۔ گلنار کو اس کی بے رخی سے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ کچھ دیر تک نرسی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ہونٹ بھینچ کر آہستہ سے بولی "بے وفا، ذلیل انسان!"

٭ ٭ ٭

اس کے بعد نرسی گلنار سے دور ہوتا چلا گیا۔ اگر کسی وقت سامنا بھی ہو جاتا تو نظریں چرا کر کترا کر نکل جاتا۔ گلنار کو شروع شروع میں تو اس کے رویے سے اذیت محسوس ہوتی لیکن پھر رفتہ رفتہ عادی ہوتی چلی گئی۔
گلنار کا باپ ذی شان بھی نرسی میں تبدیلی کو گہری نظر سے جانچ رہا تھا۔ نرسی کی مزدکیت کا اسے علم ہو چکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس بے دینی یا بدعت کو گلنار خود ہی روکنے کی کوشش کرے کیونکہ اس کے خیال میں گمراہی کو گلنار کی محبت ہی ختم کر سکتی تھی لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ ان دونوں میں کشاکش پیدا ہو گئی ہے اور گلنار میں ایک قسم کا تحمل اور مایوسی پیدا ہو گئی ہے تو وہ کچھ متردد ہو گیا۔ نرسی کا معاندانہ گریز الگ اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ گلنار چپ چاپ آتش کدے میں جا کر مناجاتیں کرنے لگی ہے تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ نرسی پوری طرح مزدکیت کے زیر اثر آ چکا ہے۔
اس نے ایک دن گلنار کو روک کر پوچھا "کیا بات ہے گلنار؟ کیا نرسی اب بھی مزدکیت پر مائل ہے؟"
"ہاں!" گلنار بدقت تمام بولی "وہ کہتا ہے میں مزدکیت نہیں چھوڑ سکتا۔"
"اچھا!" ذی شان فکر مند ہو گیا "کیا تم نے اسے یہ بتا دیا ہے کہ اگر وہ اس بدعت سے باز نہ آیا تو اسے تم سے ہاتھ دھونا پڑے گا؟"
"میں نے بتا دیا ہے۔" وہ کہنے لگی "اس نے ہمارے فیصلے کو خوشی سے قبول کر لیا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" ذی شان اور زیادہ پریشان ہو گیا "معلوم ہوتا ہے اب ہمیں مزدکیت کے خلاف کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

گلنار چپ رہی، اس کی نظریں اپنے انگوٹھے پر جمی ہوئی تھیں۔

ذی شان نے دریافت کیا "یہ تم آتش کدے میں کیوں جاتی ہو؟"

گلنار نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا "آذرخش (مقدس آگ) سے مناجات کرنے کہ وہ زرسی کے دل کو بدل دے اور وہ راہِ راست پر آجائے۔"

"جاؤ اور مسلسل جاتی رہو۔" ذی شان نے اجازت دے دی "ممکن ہے آذرخش ہمیں اس تباہی سے نکال لے"

* * *

اور گلنار چپ چاپ روزانہ ہی آتش کدے میں جانے لگی۔ پھر ایک روز اس نے یہ بھی دیکھا کہ آتش کدے میں توسیع ہو رہی ہے اور بہت سے راج مزدور اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ انہی میں اس نے خوش نواز کو دیکھا جس کی نگرانی میں یہ کام انجام پا رہا تھا اور پھر جب اس نے خوش نواز کو آتش کدے کے اندر اپنے قریب ہی معمولات کرتے دیکھا تو اگر اسے کچھ غصہ آیا تو کسی حد تک رحم بھی، کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ خوش نواز جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے لوگ مذہبی پیشواؤں کے اس معبد میں نہیں آسکتے تھے اور اگر آنے کی جرأت کر ہی بیٹھتے تو انہیں اس سزا کو بھگتنے کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا جو اس نوع کے گناہگاروں کے لیے مقرر تھی۔

بعد میں اس نے یہ سوچ کر آتش کدے کا جانا ہی موقوف کر دیا کہ اگر وہ وہاں روزانہ جاتی رہی تو شاید یہ بھی یقینی ہے کہ خوش نواز بھی روزانہ اندر داخل ہوتا رہے اور اس طرح گویا یہ طے تھا کہ خوش نواز پکڑا جاتا اور اسے آگ میں زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی۔ دوسری طرف خوش نواز بے چینی سے گلنار کا انتظار کرتا رہا۔ گو وہ یہ جانتا تھا کہ گلنار کسی موبد یا ہیربد کی لڑکی ہے اور وہ خود معمار ہے اور طبقات کا یہ فرق قطعی اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ گلنار سے محبت کرے لیکن وہ بھی کیا کرتا کیونکہ محبت کبھی بھی ذات پات یا طبقات کی قائل اور پابند نہیں رہی ہے۔

جب گلنار متواتر دو ہفتے تک نہ دکھائی دی اور خوش نواز کام بھی نپٹنے لگا تو وہ کچھ زیادہ پریشان رہنے لگا۔ وہ کئی بار ہیربدوں اور موبدوں کی آبادی میں بھی گیا کہ شاید وہاں وہ لڑکی دکھائی دے جائے لیکن ہر بار ناکام واپس آیا۔ وہ ہر اس عورت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا جو چادر میں لپٹی لپٹائی آتش کدے کی طرف جا رہی ہوتی لیکن قد و قامت اور چال ڈھال سے مایوس ہو کر واپس آجاتا۔

ایک دن صبح جب وہ کشتی سے دجلہ کے مشرقی ساحل پر اترا تو اس نے اپنے سامنے سے ایک رتھ گزرتے دیکھی۔ اس نے پہلی ہی نظر میں گلنار کو پہچان لیا جو ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے اور چہرہ چادر کے نقاب سے بے نیاز تھا۔ صبح عموماً عورتوں اور جوان لڑکیوں کے چہرے چادروں کے نقاب سے بے نیاز ہی رہتے کیونکہ اس وقت نہ صرف مقدس آفتاب کی پرستش کی جاتی تھی بلکہ صاف ہوا کی حصولیابی کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ چہرہ کھلا رہے۔

گلنار کے برابر جو شخص بیٹھا تھا اپنے لباس اور وضع قطع سے ہیربد معلوم ہوتا تھا۔ خوش نواز بے چین ہو گیا اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار پھسل کر نیچے گر گئے اور وہاں سے سینے پر آ کر رک گئے۔ اس طرح وہ اس حسین لڑکی کو فرط عقیدت سے سلام کر رہا تھا۔ گلنار پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور کنکھیوں سے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی کا جائزہ لینے لگی۔ خوش نواز کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ گلنار کے ساتھ اس کا باپ بیٹھا تھا، اس نے بھی خوش نواز کے سلام اور گلنار کی پریشانی اور احتیاط روی کو بھانپ لیا اس نے گلنار سے دریافت کیا "گلنار! کیا تم اس نوجوان کو جانتی ہو؟ یہ کون ہے؟"

گلنار نے وحشت سے جواب دیا "نہیں، میں اسے بالکل نہیں جانتی نہیں۔ یزداں ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ یہ کون ہے۔"

گلنار کا باپ یقین اور بے یقینی کے ملے جلے انداز میں بولا "پھر تمہیں یہ سلام کیوں کر رہا تھا؟"

گلنار کا دل بھر آیا لیکن اس نے انتہائی جبر سے اس پر قابو پایا، بولی: "اسے کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔"

ذیشان نے اسے تسلی دی، کہنے لگا، "مجھ سے کچھ چھپاؤ مت جو کچھ ہو سچ سچ بتا دو۔"

گلنار نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی "کوئی بات نہیں باوا جان، کوئی بات ہو تو بتائی بھی جائے۔"

ذیشان نے کوچوان کو حکم دیا "رتھ کو واپس کرو۔" اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ خوش نواز ابھی تک کھڑا ہوا رتھ پر نظریں گاڑے دیکھ رہا تھا۔ ذی شان آپ ہی آپ بڑبڑایا "شکل تو جانی پہچانی نظر آتی ہے، آخر یہ ہماری رتھ پر نظریں گاڑے کیوں کھڑا ہے؟"

خوش نواز نے جب رتھ کو اپنی طرف واپس آتے دیکھا تو اس کے دل میں خوف اور خوشی کی ملی جلی کیفیات پیدا ہو گئیں، اس نے سوچا ممکن ہے گلنار نے رتھ واپس کرایا ہو۔ اور یہ خیال بھی گزرا کہ ہو سکتا ہے گلنار کے پاس بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے رتھ واپس کیا ہو۔

گلنار کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوش نواز کو کس طرح اس کی

محویت سے باز رکھے۔ رتھ اس کے قریب آ کر رک گیا۔ خوش نواز منہ پھیر کر آگے بڑھ گیا۔ ذیشان نے اسے آواز دی: "اے نوجوان! ذرا ٹھہرنا تو!" اور وہ رتھ سے اتر کر خوش نواز کی طرف بڑھا۔

خوش نواز خوفزدہ، سہما ہوا کھڑا ہو گیا۔ ذیشان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا: "کیا تم ہمیں جانتے ہو؟" اس کے بعد فوراً ہی آنکھوں کے گوشے سمٹ گئے اور ذہن پر زور دیتا ہوا بولا "میں نے تمہیں دیکھا ہے۔"

خوش نواز نے جواب دیا "ہاں، مقدس موبد! میں خوش نواز، آتش کدے کے زیر تعمیر توسیعی حصے کا میر معمار ہوں، آپ نے مجھے وہیں دیکھا ہوگا۔"

ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، بولا "خوب! یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔" پھر کہنے لگا "یزدان تمہارا بھلا کرے تم نے مجھے کیا کہہ کر مخاطب کیا تھا ابھی؟ مقدس موبد؟ لیکن میں موبد نہیں ہوں، میں ہیربد ہوں۔ خاندان اور بستی کے آتش کدوں کی آگ کو فروزاں رکھنا ہمارے ذمے ہے۔"

خوش نواز ادب اور احترام سے اس کے آگے جھک گیا۔ ذیشان نے اسے سیدھا کیا اور کہنے لگا: "جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی تم نے ہمیں سلام کیا تھا۔"

خوش نواز نے بات بنائی "ہاں مقدس ہیربد! میں پہلے بھی آپ کو سلام عرض کر چکا ہوں۔"

ذیشان مسکرایا، پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

خوش نواز نے جواب دیا: "آذر فرونگ۔"

ذیشان اسے رتھ کی طرف لے کر بڑھا، کہنے لگا "تو میرے ساتھ چلو، ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔"

گلنار خوفزدہ اور سہمی ہوئی اپنے باپ اور خوش نواز کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب ذیشان، خوش نواز کو ساتھ لے کر رتھ کی طرف واپس ہوا تو گلنار کی جان نکل گئی۔ وہ سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی اور اہورا مزدا سے اپنے لیے خیر کی دعا کرنے لگی۔

ذیشان رتھ پر چڑھتا ہوا بولا "گلنار! یہ نوجوان تو اپنا میر معمار ہے۔ مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہو گئی، یہ تو مجھے سلام کر رہا تھا۔" پھر گلنار سے مل کر بیٹھ گیا اور خوش نواز کو اپنے برابر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ بولا "تم ادھر بیٹھ جاؤ میرے قریب!"

جب خوش نواز بھی بیٹھ گیا تو ذیشان نے کوچوان کو رتھ چلانے کا حکم دیا اور رتھ چل پڑا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم اور روح کو تازگی اور شگفتگی بخش رہے تھے۔

ذیشان کچھ زیادہ ہی باتونی تھا خوش نواز سے دریافت کیا "تم ہر روز مسلو کیا سے آتے ہو نا"؟
"ہاں، "خوش نواز نے جواب دیا۔
ذیشان نے دریافت کیا "وہاں مزدکیت کا کیا حال ہے؟"
خوش نواز نے جواب دیا "یہ دین بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔"
ذی شان اس کی بات کاٹتا ہوا بولا "ہاں یہ دین نوجوانوں اور غریبوں میں زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اور چونکہ ہمارا بادشاہ قباد بھی مزدکی ہو چکا ہے، اس لیے لوگوں کو کچھ زیادہ ترغیب مل رہی ہے۔"
خوش نواز نے کوئی جواب نہ دیا۔ یکایک ذی شان نے چونک کر سوال کیا: "اور تم؟ تم محفوظ ہو اس مزدکیت سے؟"
خوش نواز نے جواب دیا "میں اسے بدعت سمجھتا ہوں۔"
"ہاں تم دین دار نظر آتے ہو۔" ذیشان کہنے لگا "ورنہ بہت زیادہ نوجوان گمراہ ہو چکے ہیں، مزدکیت کی ساری باتیں اچھی ہیں لیکن دو باتیں بری ہیں، ایک تو یہ کہ اس میں ذاتی املاک ختم کرنے کا ناقابلِ عمل حکم دیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں محرمات کو ختم کر دیا گیا ہے۔" پھر سوال کیا "نوجوان! تمہارا نام کیا ہے؟"
"خوش نواز۔" اس نے جواب دیا اور ذیشان ہنسنے لگا، بولا "نام تو بہت اچھا ہے اور تم میں یہ خوش نوازی اسی وقت تک ہے جب تک تم زرتشت کے مذہب و دین پر قائم ہو۔ جہاں تم گمراہ ہوئے اور بہک کر مزدکیت کی طرف مائل ہوئے تمہاری خوش نوازی بھی رخصت ہو جائے گی۔"
کوچوان نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور غصے میں گھوڑوں کو تیز ہانکنا شروع کر دیا۔
ذیشان نے سرگوشی میں کہا "مجھے شبہ گزرتا ہے کہ یہ کوچوان بھی مزدکی ہے اور ہم سے اپنے عقائد چھپائے ہوئے ہے۔"
گلنار کنکھیوں سے خوش نواز کو دیکھ رہی تھی۔ خوش نواز نے کہا "مزدکیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے موبدِ اعظم بھی کچھ کر رہے ہیں یا نہیں؟"
ذیشان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا "تمہیں اس کا علم کیونکر ہوا؟"
خوش نواز نے جواب دیا "کس بات کا علم؟"
"یہی کہ مزدکیت کو روکنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔"
خوش نواز نے جواب دیا "مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں نے تو یونہی یہ سوال کر دیا تھا۔"
ذیشان خوش ہو گیا۔ بولا "اس سلسلے میں پھر بات کروں گا۔ اس وقت تو مجھے یہ دکھ ہوا ہے کہ میرا بھتیجا

نرسی بھی مزدکی ہو گیا ہے!" یہ کہتے کہتے وہ اداس ہو گیا۔ اس نے مڑ کر گلنار کو دیکھا جو نرسی کے نام پر کچھ اداس ہو گئی تھی۔

خوش نواز کے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی جو اُسے تکلیف پہنچانے لگی "نرسی یعنی آپ کا بھتیجا بھی مزدکی ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔" ذیشان کچھ سوچنے لگا اور بے خیالی میں بڑبڑایا "نرسی کا مزدکی ہو جانا یوں تو اتنی خاص بات نہ تھی لیکن بدقسمتی سے وہ گلنار میری بیٹی کا ہونے والا شوہر بھی تھا۔ اس کی مزدکیت کا سب سے زیادہ صدمہ میری بیٹی گلنار ہی کو جھیلنا پڑا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں!"

سامنے ہی آتش کدے کا گنبد صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ گنبد، جسے اشبت کہتے تھے، سو ہاتھ لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کے اوپر بہت سے نیزے گڑے ہوتے تھے اور ان میں جھنڈے لہرا رہے تھے۔ رتھ اس کے حدود میں داخل ہو گیا تو ذیشان کہنے لگا "کیا نام بتایا تھا؟ خوش نواز؟ تو خوش نواز تم پہلے میرا گھر دیکھ لو۔ جب تم آتش کدے کا کام ختم کر چکو تو تھوڑا سا ہمارا کام بھی کر دینا۔ میں اپنے گھر کے آتش کدے کے باہری حصے میں ایک حجرہ بنوانا چاہتا ہوں!"

خوش نواز کو خوشی ہوئی کہ چلیے اس طرح وہ اس لڑکی کا گھر تو دیکھ لے گا، اور دوسرے یہ کہ اب اس گھر میں آمد و رفت کی راہ پیدا ہو چلی تھی لیکن یہ دکھ بھی تھا کہ گلنار کی اپنے چچا کے لڑکے نرسی سے نسبت طے پا چکی تھی لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ شاید اس کی خوش قسمتی سے نرسی مزدکی ہو چکا ہے جس سے اب گلنار کا وابستہ ہونا ناممکن بات تھی لیکن یہاں یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ ہو سکتا ہے گلنار کی محبت نرسی کو مزدکیت ترک کر دینے پر آمادہ کر دے اور وہ پھر سے بہ دین میں واپس آ کر گلنار کو حاصل کر لے۔ اس آس اور مایوسی کے خیالات اور تفکرات نے اسے بڑا پریشان کیا۔

جب ذرا دیر بعد رتھ ایک مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا تو خوش نواز کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ تینوں یکے بعد دیگرے رتھ سے نیچے اُتر گئے تو ذیشان نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ رہا میرا مکان۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے دروازے کی اوپری محراب میں اہواز مزدا کی شبیہ بنی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد کوچوان کو حکم دیا "کوچوان! انہیں وہاں پہنچا دو جہاں عمارت میں توسیع کا کام ہو رہا ہے!"

اس کے بعد ذیشان گلنار کو لے کر مکان کی طرف بڑھا۔ گلنار نے چلتے چلتے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ خوش نواز رتھ میں سوار ہوتا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو گلنار نے فوراً منہ پھیر لیا۔ اس وقت ذیشان کہہ رہا تھا: "وہ معمار ہے تو کیا ہوا لیکن نوجوان نیک معلوم ہوتا ہے۔"

سامنے اہواز مزدا (یزدان) کا بت دیوار میں اُبھرواں بنا ہُوا تھا۔ اہوزا مزدا کائنات میں معلق کھڑا تھا۔ انسانی شکل کے اہواز مزدا کے سر پر ٹوپی سے مشابہ تاج رکھا ہُوا تھا۔ پیچھے گدی پر بالوں کے پٹے نما گچھے تاج کے باہر نکلے ہُوئے تھے داڑھی سینے سے گزر کر ناف تک آگئی تھی۔ سینے سے ذرا نیچے اور ناف کے اُوپر سے بے شمار پروں کا سلسلہ رانوں تک پھیلا ہوا تھا اور یہ پر آس پاس پوری کائنات پر محیط تھے۔ اہوزا مزدا کا زیریں لباس بھی پروں کے مشابہ تھا۔ رانوں کے آس پاس سے دو آنکڑے نمودار ہو کر نیچے پیروں تک چلے گئے تھے اور ان کے آخری سرے مُڑ کر گول پہیے کی طرح ہو گئے تھے۔ چونکہ اہوزا مزدا کے پیر نہیں دکھائی دیتے تھے اس لیے شاید وہ خلا میں اپنے انہی دو آنکڑوں پر رُکا ہُوا تھا۔ بایاں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا ہُوا تھا اور داہنا ہاتھ ایک پہیے کے دستے پر تھا۔ جس سے وہ نظامِ کائنات کو حرکت میں لا رہا تھا اور نیچے کی فضا روشنیوں اور بادلوں سے معمور تھی۔ اس بُت کو قیمتی ریشمی پردے میں چھپا کر رکھا گیا تھا لیکن اس وقت گلنار اس کے آگے گھٹنوں کے بل جھکی اوِستا کا ایک سرود ترنم میں گا رہی تھی اور ریشمی پردہ سامنے ایک لکڑی کی تپائی پر رکھا ہُوا تھا۔

گلنار گا رہی تھی ؛

"ایک دن جبکہ اہوزا مزدا اپنی جگہ پر پوری آن بان اور شان و شوکت سے دربار لگائے بیٹھا تھا، ایک طرف سے روحِ کائنات بین کرتی ہوئی حاضر ہوئی اور اہوزا مزدا سے شکایت کی کہ انسان اس کی دیکھ بھال سے عاجز آچکا ہے اور اپنی غفلت، لاپروائی اور اہرمنی طاقتوں سے اس کی تباہی اور بربادی کے در پئے ہے۔

اہوزا مزدا کے داہنی طرف زرتشت بھی موجود تھا۔ اس نے زرتشت کو اشارے سے سامنے بلایا اور اسے زمین کی دیکھ بھال اور اصلاح کے لیے نامزد کر دیا۔

زمین نے اس نامزدگی پر تعجب کا اظہار کیا اور اہوزا مزدا سے کہنے لگی "اے اہوزا مزدا! جس سے تو واقف ہے، میں اس سے لاعلم ہوں لیکن یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ ایک ضعیف انسان میری دیکھ بھال کس طرح کر سکے گا ؟"

اہوزا مزدا نے زمین کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور کہا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتیں۔

اور زرتشت کو زمین کی دیکھ بھال اور اصلاح کے لیے زمین پر بھیج دیا گیا۔"

جب گیت ختم ہو گیا تو گلنار نے دعا مانگی: "اے اہوزا مزدا! زرتشت تو اپنا کام ختم کر کے واپس جا چکا ہے لیکن اب ایک اہرمنی قوت مزدک کے نام سے دنیا کے امن و امان اور نیکی کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تو زرتشت کو دوبارہ بھیج تاکہ دنیا اہرمنی شر اور فساد سے محفوظ رہے۔"

دعا ختم کر کے اس نے لوبان اور صندل سلگایا جس سے کمرہ معطر ہو گیا۔ دھوئیں کے بادل پورے کمرے میں پھیل

گئے۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کو معلوم ہُوا کہ باہر میر معمار اس سے ملنے آیا ہُوا ہے۔ گلنار کا باپ ذیشان گھر پر موجود نہ تھا۔ گلنار نے خدمت گار خاتون سے کہلا دیا کہ "اس سے کہہ دو، بادا جان گھر میں موجود نہیں ہیں، پھر کسی وقت آئیے۔"

لیکن میر آن پر بھی نہ ٹلا اور اس خاتون سے کہلا دیا کہ اندر کہہ دو، میرا کام ختم ہو رہا ہے۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں مجھے ایک حجرہ تعمیر کرنا ہے۔"

مجبوراً اسے خوش نواز کے سامنے آنا پڑا۔ اس وقت خوش نواز کچھ زیادہ مستعد اور دلکش نظر آ رہا تھا۔ گلنار کو دیکھتے ہی وہ جھک گیا اور رہبر بد کی خوبصورت لڑکی کی خدمت میں آداب بجا لایا۔

گلنار نے بے رُخی کا مظاہرہ کیا، خشک لہجے میں بولی: "اس وقت بادا جان گھر میں موجود نہیں ہیں۔"

خوش نواز کا دل ڈوبنے لگا۔ "میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں مجھے ایک نیا حجرہ تعمیر کرنا ہے۔"

گلنار نے ذرا تامل اختیار کیا، پھر اسے لے جا کر وہ جگہ دکھا دی۔

خوش نواز نے دریافت کیا "مقدس ہیر بد کب تشریف لائیں گے؟"

گلنار نے جواب دیا "دوپہر بعد۔"

خوش نواز نے التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھا، پوچھا "ہیر بد کی معزز بیٹی! یہ میری مجال نہیں کہ میں آپ کا نام لوں لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ مجھ سے وہ کونسی غلطی سرزد ہو گئی ہے جس کی سزا مجھے دی جا رہی ہے؟"

گلنار نے جلدی سے کہا "تمہیں کوئی سزا نہیں دی جا رہی۔ یہ کس نے کہا کہ تمہیں کوئی سزا دی جا رہی ہے۔"

خوش نواز بولا "میں ہیر بد کا ادنیٰ خادم، اس لائق بھی نہیں سمجھا جا رہا کہ اگر کسی وقت قدم بوسی کے لیے حاضری دوں تو باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جاتے۔"

گلنار اس چرب زبان کی باتوں سے متاثر ہونے کے بجائے مسکرانے لگی۔ خوش نواز کو محسوس ہُوا کہ اس ایک مسکراہٹ کی شکل میں اسے اس شئے کا بیعانہ مل گیا جس کا وہ طالب ہے۔

گلنار نے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ کہ اگر میں کسی طرح آپ لوگوں کے کام آسکتا ہوں تو مجھ سے کام لیا جائے۔"

اسی لمحے ذیشان آگیا۔ وہ بہت فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ خوش نواز کو دیکھ کر چونک پڑا۔ "تم یہاں کیسے؟"

گلنار نے کہا "یہ وہ جگہ دیکھنے آیا تھا جہاں حجرہ تعمیر ہوگا۔"

ذیشان مسکرا کر بولا "اور تب پھر دکھا دی وہ جگہ؟"

"ہاں دکھا دی۔" گلنار نے جواب دیا۔

خوش نواز کا خیال تھا کہ ذی شان اسے بٹھائے گا لیکن اس نے سرد مہری سے کام لیا۔
خوش نواز نے جب ان کا یہ رنگ دیکھا تو واپسی کی اجازت چاہی مگر ذی شان بولا "اجازت دینے سے پہلے میں تم سے کچھ دریافت لینا چاہتا ہوں۔"
"بتایئے" خوش نواز نے جواب دیا "مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے لیکن میں اپنی گزارش بعد میں کروں گا۔ سرِدست اس کا موقع بھی نہیں ہے۔"
ذی شان نے پہلے تو خوش نواز کو گھورا پھر گلنار کو معنی خیز نظروں دیکھنے لگا۔
گلنار خواہ مخواہ صفائی نہیں دینا چاہتی تھی، اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی۔
ذیشان نے خوش نواز سے کہا "اس وقت تو تم جاؤ پھر بات کروں گا۔"
خوش نواز نے سوچا کہ یہ کیا بات ہوئی پہلے تو اس کا پھر جانے کی اجازت دے دی لیکن اس میں اتنی مجال نہ تھی کہ مقدس ہیربد سے جرح بحث کرتا۔ جب وہ جانے لگا تو ذیشان نے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟ خوش نواز ممکن ہے دو ایک دن میں مجھے کوفہ جانا پڑے تم اس سے پہلے ہی مجھ سے آکر مل لو۔"
خوش نواز نے پوچھا "کل صبح آکر مل لوں؟"
"نہیں!" ذی شان تمکنت سے بولا "میں تمہیں کسی ایسے وقت میں نہیں بلاؤں گا جب تم آتش کدے کی خدمات انجام دے رہے ہو گے، مجھ سے تم کل شام کو مل لینا۔"
دوسرے دن شام کو جب وہ ذیشان سے ملنے گیا تو اسے کچھ غیر معمولی باتیں محسوس ہوئیں، وہاں ایک پُراسرار خاموشی سی چھلپل برپا تھی گھر پر ذی شان تو نہیں موجود تھا لیکن ایک دوسرا نوجوان گلنار سے باتیں کر رہا تھا۔
گلنار نے اسے بٹھا لیا۔ بولی "بابا جان آنے والے ہیں تم ان کا انتظار کر لو۔" پھر اپنے ساتھ کے نوجوان سے کہنے لگی "نرسی! تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔ یہ نوجوان میر معمار خوش نواز ہے، بابا جان اس سے ایک حجرہ تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔"
نرسی پہلو بدلتا ہوا بولا "میں کسی غلط فہمی کا شکار کیوں ہونے لگا، میں اس وقت محض اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ تمہارا آخری بار عندیہ معلوم کر لوں۔"
گلنار بے بسی اور مایوسی سے اس کی صورت تکنے لگی۔
نرسی کہنے لگا "بادشاہ قباد نے مزدکیت کو قبول کر لیا۔ ہمارا رہ عنقریب اپنا خزانہ غربا میں تقسیم کرنے والے ہیں، شہزادوں میں کاؤس نے بھی مزدک کا دین اختیار کر لیا ہے، رہ گیا چھوٹا شہزادہ خسرو، جو شاید ولی عہد بھی ہے عنقریب ہمارے دین میں آنے والا ہے کیا تم لوگ اب بھی مزدکیت کی سچائی پر شبہ کرتے ہو؟"

گلنار نے کہا "میں ایک شرط پر مزدکیت قبول کر سکتی ہوں، وہ بھی محض تمہارے لیے!"
"کون سی شرط؟"
"یہ کہ اگر میں تمہاری خاطر مزدکیت اختیار کر لوں تو میں محض تمہاری بیوی بن کر رہوں گی، ہیراکسی اور مزدکی سے کوئی واسطہ نہ رہے گا!"
یہ کس طرح ہو سکتا ہے!" نرسی نے جواب دیا "کسی مذہب کو اختیار کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کے کچھ اصول اختیار کر لیے جائیں اور کچھ مسترد کر دیئے جائیں!"
گلنار نے بیزاری سے کہا "میں سوچتی ہوں لوگوں نے کس طرح یہ گوارا کر لیا ہے کہ ان کی عورتوں کو سب کی ملکیت سمجھ لیا جائے۔ آخر ان کی غیرت کو کیا ہو گیا!"
"گلنار! یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی بس ذرا ایثار کی بات ہے تم مزدکیت سے دور رہ کر اس کے فوائد کو کس طرح سمجھ سکتی ہو، یہ ہجر و فراق، عشق و محبت، بندشیں، رکاوٹیں، پہرے، چوکیداریاں، رقابتیں، مایوسیاں، ــــ مزدکیت نے ان چیزوں کے وجود کو مٹا کر رکھ دیا ہے، عورت جو آزاد پیدا کی گئی ہے آزاد رہے گی، مرد جو آزاد پیدا ہوا ہے آزاد رہے گا۔ میں کسی ایسی آزادی کو تسلیم نہیں کر سکتا جو لفظوں میں تو موجود ہو لیکن معنوں میں مفقود۔ ہم نے جھوٹے اخلاق کے نام پر بہت سی ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لی ہیں جنھوں نے ہماری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے!"
خوش نواز کو نرسی کی باتوں میں بڑا مزا آ رہا تھا اس نے سوچا کہ اگر مزدکیت یہی ہے کہ اسے اختیار کرتے ہی عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے بالکل آزاد ہو جاتے ہیں تو بڑا اچھا دین ہے، اس صورت میں گلنار اس کے لیے کتنی سریع الحصول ہو جاتی تھی۔ نرسی بہت ذہین تھا وہ اس کی دلی کیفیات کسی حد تک سمجھ گیا چنانچہ فوراً ہی خوش نواز سے مخاطب ہوا "کیوں جناب! میں نے جو کچھ کہا ہے تم نے بھی کچھ سُنا؟"
خوش نواز نے جواب دیا۔ "ہاں جناب سنا!"
"تم کس حد تک اس سے اتفاق کرو گے؟"
خوش نواز کے سامنے مصلحتیں تھیں، یہ مصلحت کہ گلنار خود ان باتوں سے متفق نہ تھی اور یہ کہ وہ ہیربد کی بیٹی تھی جس کے دین سے مزدکیت نبرد آزما تھی اسے کچھ کچھ یقین آ رہا تھا کہ نرسی صحیح کہہ رہا ہے لیکن اس نے یہی جواب دیا کہ "میں آپ کی باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ گناہ ہے ــــ آوارگی اور عیاشی ہے!"
"بے وقوف، ماضی کے پرستار، قدامت کے خوگر!" نرسی کو غصہ آ گیا۔ "تم جو طبقات اور روایات کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہو، تعجب ہے تم ان انسانیت سوز امر دم آزار لیوں پر بغاوت کیوں نہیں کر رہے۔" پھر کچھ سوچتا ہوا بولا "بات کچھ اور ہے تم ضرور موقع پرست ہو!" اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ نوجوان معمار گلنار کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ

جن میں کوئی پیغام ہے۔ اس نے خوش نواز کے دل کو ٹٹولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میری منگیتر گلنار کو پسند کرنے لگے ہو، اگر میرا قیاس درست ہے تو تم ضرور اس دوشیزہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھ سے اتفاق نہیں کر رہے ہو۔"

پھر وہ اپنے دین مزدکیت کی تبلیغ کرنے لگا۔ "اگر تمہارا حسن کے اس انمول شاہکار پر واقعی دل آگیا ہے تو میں تمہیں مزدکیت کی دعوت دوں گا۔ مزدکیت قبول کر کے اپنی محرومیاں دُور کر سکتے ہو، مزدکیت کے دائرے میں آتے ہی تم دولت اور عورت کی محرومی سے نجات پا جاؤ گے، طبقات ختم ہو جائیں گے، مساوات عام ہو جائے گی۔ کوئی بھی عورت حسین ہو یا بدصورت تم پسند کر کے با آسانی حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ یہ گلنار جو غالباً ہم دونوں کی پسند ہے، اگر یہ بھی ہمارے دین میں آجائے تو دونوں ہی اس سے شادکام ہو سکتے ہیں اور یہ ہم دونوں سے۔"

گلنار غصے میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "نرسی! آج سے ہم دونوں کے تعلقات ختم۔ تم بہت بیہودہ ہو گئے ہو۔ میں یہ بے ہودگیاں نہیں برداشت کر سکتی۔"

نرسی نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ "تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ اس وقت میں تم سے بالکل مایوس ہو چکی ہوں، اتنی مایوس کہ آئندہ کوئی میری زبان سے تمہارا نام تک نہ سُنے گا۔ بے حیا، بے شرم، بے دین کہیں کا۔"

گلنار اندر چلی گئی اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

نرسی خوش نواز سے مخاطب ہوا۔ "کسی نئی چیز کو مشکل ہی انسان قبول کرتا ہے۔" پھر پوچھا۔ "کیا تمہیں ہمارا دین پسند آیا۔ اگر پسند کرو تو آج ہی میرے ساتھ چلو اور حضرت مزدک کے ہاتھوں پر اس کا دین قبول کر لو۔ اس میں آتے ہی تم سیکڑوں گلناروں کو اپنے آس پاس آغوشیں پھیلائے ہوئے دیکھو گے۔ ذاتی ملکیت کا تصور ہی غلط ہے۔" پھر کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اہورامزدا نے اگر انسان کو ہوا پانی اور دھوپ پر بھی اختیار دے دیا ہوتا اور یہ انہیں بھی اپنی ذاتی املاک بنا کر دینے نہ دینے پر قادر ہوتا، سوچو تو بھلا کتنے انسان زندہ رہتے اور جو زندہ رہتے ان میں کمزور طاقتور کے سامنے کتنے بے بس، مجبور اور بے آسرا ہوتے۔ اہورامزدا نے اسی لیے تو انہیں اپنے اختیار میں رکھا ہے کیونکہ اس نے انسانوں کی خودغرضی کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

خوش نواز کے دل میں اپنی لالچ نے سر اُٹھایا لیکن یہ سوچ کر وہ ہاں، کرنے سے باز رہا کہ کہیں اسی طرح، جس طرح گلنار نے نرسی کو دھتکار دیا ہے۔ اسے بھی نہ دھتکار دے، اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

نرسی نے انگڑائی لیتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ "خیر کوئی بات نہیں، آج نہیں تو کل تم پر بھی مزدکیت کی سچائی ظاہر ہو کر رہے گی۔ ہو سکتا ہے۔ تم ابھی یہ سوچ رہے ہو کہ گلنار میری طرف سے مایوس ہو کر تمہاری طرف راغب ہو جائے گی لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ گلنار میر بد کی بیٹی ہے اور تم معمار ہو ایک معمار کی اولاد، یہ فرق ہمیشہ ہی رہے گا، دُور نہیں

ہو سکتا۔ میں تمہیں بتا دوں کہ تم کسی طرح بھی گلنار کو حاصل نہیں کر سکتے۔"
اس کے بعد نرسی چلا گیا۔ خوش نواز تنہا رہ گیا۔
اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ ذیشان کا کہیں پتہ نہ تھا، ذرا سی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور موم کی شمع لیے ہوئے گلنار نمودار ہوئی۔ اس نے دیوار کے ایک طاق نما حصے میں شمع رکھ دی اور خوش نواز سے دریافت کیا "نرسی کب گیا؟"
"وہ اسی وقت چلا گیا تھا آپ کے جاتے ہی!"
میرے چلے جانے کے بعد وہ کیا کہتا تھا؟"
"مجھ سے کہتا تھا مزدکیت اختیار کر لو۔"
"اور تم نے کیا جواب دیا؟"
"میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں بے دینی اور بے شرمی پر موت کو ترجیح دوں گا۔"
وہ آہستہ سے بولی "تم نے بہت اچھا جواب دیا مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی، تم نے مجھے مسرور کیا۔" پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی "نرسی کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے، یہ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ ہم دونوں میں پرانی محبت تھی، میرا خیال ہے مزدک کوئی بہت بڑا جادوگر ہے جو اپنے جادو سے لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ دیکھو کہیں غلطی سے تم اس کے روبرو نہ چلے جانا۔ سنتی ہوں اس نے ہمارے بادشاہ پر بھی جادو کر دیا ہے اور وہ بھی مزدکی ہو گیا ہے۔ اور دربار میں خود نیچے بیٹھتا ہے اور مزدک کو سونے کی کرسی پر اپنے سے اونچی جگہ پر بٹھاتا ہے!"
خوش نواز نے موقع غنیمت جانا اس نے محسوس کیا کہ گلنار کے لہجے کی شکست خوردگی میں اس کے لیے امید کی کرن پائی جاتی ہے، ضرورت سے زیادہ چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے کہنے لگا "ہر سمجھدار آدمی کا یہی خیال ہے کہ مزدک ساحر ہے اپنے سحر سے لوگوں کی شرم دھیا دور کر رہا ہے!"
گلنار رو دینے سی ہو رہی تھی، چہرہ شمع کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔ خوش نواز کو وہ بہت اچھی لگ رہی تھی، دلکش اور باوقار، کہنے لگی "میں نرسی سے بیزار ہو گئی ہوں، میں نے اسے ہمیشہ کے لیے دھتکار دیا ہے کیونکہ مجھے کچھ یہ یقین ہو چلا ہے کہ اس کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ پھر ایسے مریض کو اپنے پاس کیوں آنے جانے دیا جائے جس کا مرض چھوت کا ہو، جو کسی اور کے بھی لگ سکتا ہو!" خوش نواز کو مزید تاکید کی "اور دیکھو تم بہت بچ کے رہنا، نوجوانوں پر اس کا جلدی اثر ہو جاتا ہے۔"

خوش نواز نے اسے مزید یقین دلایا "آپ مطمئن رہیں مقدس ہیربذزادی! میں اپنے دین کا راسخ العقیدہ
پیرو ہوں۔"

نرسی کو دھتکار دینے کے بعد گلنار خود کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگی تھی، ایسی تنہائی جس کا حال سے مستقبل
کے ناپیدا کنار سرحدوں تک پرتو ہو۔ وہ اس تنہائی میں کسی حد تک کمی چاہتی تھی، اداس رُوح کوئی سہارا چاہتی
تھی اور یہ سہارا اتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو جتنا ڈوبتے کو تنکے کا ہوتا ہے۔ اس نے پہلی بار محبت کی مسکراہٹ سے
خوش نواز کو دیکھا، کہنے لگی "تم بڑے اچھے نوجوان ہو۔ دینی استقامت پر پہاڑ کی طرح قائم رہنے والے، سچ
کہتی ہوں، میں تمہارے جواب سے بہت خوش ہوئی ہوں کاش تم ہمیشہ ہی ایسے رہو جو اس وقت ہو!"

خوش نواز کا حوصلہ بڑھا۔ کہنے لگا "مجھے اپنا دین محض اس لیے ہی نہیں عزیز ہے کہ یہ میرا اپنا دین ہے،
میرے باپ دادا کا دین ہے بلکہ یہ یوں بھی عزیز ہے کہ یہ آپ کا دین ہے اور آپ اس پر بے مثال قوتِ ارادی
سے قائم ہیں!"

"اچھا" اس کے مُردنی چھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی "لیکن اگر تم یہ سب کچھ کسی غلط توقع
کی بنا پر کہہ رہے ہو تو تمہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا!"

شاداب ہوتا ہوا چہرہ ایک بار پھر مُرجھا گیا۔ گلنار نے آبیاری کی "تم دیندار اور نیک نوجوان ہو، میں ایسے
لوگوں کو پسند کرتی ہوں، اگر مناسب سمجھو تو کبھی کبھی آجایا کرو!"

ذیشان کافی دیر بعد آیا۔ خوش نواز کو اپنا منتظر پا کر خوش ہوا۔ کہنے لگا "آج تم سُلو کیا واپس جاؤ کل تمہیں
شام کو پھر آنا ہے۔" وہ غیر معمولی تھکا تھکا دکھائی دیتا تھا "ہم سب پر مزدکیت کی شکل میں ایک بہت بڑی
مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے شاید کول جانا پڑے اور وہاں کے موبد اعظم کو
ساتھ لانا پڑے۔ بس وہی ہے جو ہمیں مزدکیت کے تخریب کاروں سے بچا سکتا ہے۔ یہ فتنہ نہ روکا گیا تو تباہی آجائے
گی۔"

خوش نواز کی سمجھ میں یہ باتیں آ ہی نہیں رہی تھیں پھر وہ کچھ بولتا تو کیا بولتا۔

ذیشان کہتا رہا "مزدک نے تو ہم سب کی عزت کو خاک میں ملا کر رکھ دیا، کیا نام ہے تمہارا؟ خوش نواز؟
تم خود ہی سوچو کہ جب سب برابر ہو جائیں گے اور ہم میں کوئی چھوٹا بڑا نہ ہوگا تو اس معاشرے میں بادشاہ،
شہزادے، امرا، شرفا، موبد اعظم اور دیگر دینی پیشواؤں کا کیا مقام ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، ہمیں مجبوراً مل کر مزدکیت
کا مقابلہ کرنا ہے، اس وقت مذہب مجبور ہے کہ وہ حکومت سے مل کر اس فتنے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچل دے
اور حکومت اس پر آمادہ ہے کہ وہ مذہبی پیشواؤں کی اعانت سے مزدکیت کے لیے ایک ایسا منصوبہ تیار کرے

کہ یہ فتنہ پھر کبھی نہ سر اٹھا سکے، مذہب اور حکومت ایک دوسرے کے محافظ اور مددگار ہیں اور اگر اہورامزدا اور زرتشت نے چاہا تو ہم سب مل جل کر عنقریب، مزدکیت، ایک خطرناک بدعت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں گے، اگر ہم نے اسی وقت اس طوفان کو نہ روکا تو آنے والی نسلیں اس عذاب سے کسی طرح نہ بچ پائیں گی، یہ شر، شور اور فتنہ جو لوگ اٹھ کھڑے ہونگے تو پھر انہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔"

گلنار باپ کی باتیں سن سن کر پرسکون نظر آرہی تھی اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ ذی شان نے خوش نواز کو دوسرے دن شام کو پھر بلایا تھا۔

باہر رتھ تیار کھڑا تھا۔ خوش نواز حیران تھا کہ ذیشان اس کی اتنی عزت کیوں کر رہا ہے؟ دونوں باپ بیٹی اسے رتھ تک چھوڑنے گئے۔ جب رتھ چلا گیا تو ذی شان گلنار کو لے کر گھر کے اندر گیا اور بے پناہ خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا: "گلنار! یہ سادہ لوح معمار ہے لیکن تم دیکھنا اس سے ایک شاندار کام لیا جانے والا ہے کہ وہ کام رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ یہ معمار ہے لیکن اس سے ایسی زمین تیار کرائی جائے گی جس پر مزدکیوں کا باغ تعمیر ہوگا شاندار اور یادگار باغ جو ہمیشہ ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔"

❖

آذر فرونگ کے آس پاس میلوں تک فوجیں متعین کر دی گئیں، ان حدود میں آباد انسانوں کو ان کے گھروں میں قید کر دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تیسفون سخت مصیبت میں گھر گیا اور کوئی زبردست انقلاب آنے والا ہے، ہیربد ذیشان کا رتھ دجلہ کے مشرقی ساحل پر خوش نواز کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جیسے ہی کشتی سے ساحل پر اترا رتھ کے کوچوان نے اس کا استقبال کیا اور اسے رتھ میں بٹھا کر آذر فرونگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے سنسان اور ویران تھے مختلف ہتھیاروں سے لیس سپاہی جگہ جگہ حرکت میں تھے خوش نواز کچھ ڈر گیا۔ اس نے کوچوان سے دریافت کیا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ جگہ جگہ یہ فوج کیوں متعین ہے اور راستے ویران اور سنسان کیوں پڑے ہیں؟"

کوچوان نے لاپرواہی مگر نفرت سے جواب دیا: "ولی عہد شہزادہ خسرو آذر فرونگ کے بڑے ہال میں امرا اور مذہبی پیشواؤں کی مدد سے ایک مجلس شوریٰ منعقد کر رہا ہے جہاں یہ طے پائے گا کہ کیا شہزادے کو بھی اپنے باپ کی طرح مزدکیت اختیار کر لینی چاہیے! شہزادہ اس سلسلے میں موبد اعظم سے بھی مشورہ کرے گا۔"

خوش نواز چپ ہو گیا۔ اس دن اسے عمارت میں توسیع کا کام نہیں کرنا پڑا اسے ہیربد ذی شان کے مکان میں ٹھہرا دیا گیا جہاں وہ سارا دن بند رہا۔ گلنار بھی اس سے دور دور رہی تنہا پڑے پڑے اس کا دل اکتا گیا۔ ذیشان بھی کسی وقت آتا اور تسلی اور اطمینان کے چند کلمات ادا کر کے چلا جاتا۔

سہہ پہر کو گلنار اس کے پاس آئی اور اسے مشورہ دیا۔ "دیکھو مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم سے کوئی بہت بڑا کام لیا جانے والا ہے۔ وہ اعظم شہزادہ خسرو اور دربار کے دوسرے امراء اس کے صلے میں تمہیں کچھ دینا چاہیں گے تم ابھی سے یہ سوچ لو کہ تمہیں ان سے کیا طلب کرنا ہے؟"

خوش نواز کو ایسے لگا جیسے اس کی منزل سامنے آچکی ہے، دل خوشی سے جھوم اٹھا، لہجے میں خود اعتمادی اور شوخی آگئی۔ پوچھا۔ "مجھ سے کیا کام لیا جانے والا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی!"

"پھر بھی کوئی اشارتاً اتا پتہ؟"

"میں کچھ نہیں جانتی لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ کام غیر معمولی ہے اور تم اسے بہت اچھی طرح انجام دے سکتے ہو!"

"اچھا!" اس نے سوالیہ نظروں سے گلنار کو دیکھا۔ "آپ ہی بتائے کہ اس کے صلے میں مجھے کیا مانگنا چاہیے!"

"یہ فیصلہ تو تمہیں خود کرنا ہے اس سلسلے میں، میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی؟"

"میں جو سب سے بڑی شے مانگ سکتا ہوں وہ ایک ہی ہے!"

"وہ کیا؟"

اس سلسلے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا!

"پھر بھی کچھ مجھے بھی تو بتاؤ، ہو سکتا ہے میں تمہیں کوئی اچھا سا مشورہ دے سکوں!"

خوش نواز نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ "اپنی اس بڑی خواہش کے اظہار کے لیے پہلے آپ سے اجازت بہت ضروری ہے؟"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ میں اپنی زندگی کی جس سب سے بڑی خواہش کا اظہار کر سکتا ہوں، میرے نزدیک وہ آپ کی ذات ہے؟" یہ کہتے کہتے خوش نواز مارے رعب اور دہشت کے گر گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

گلنار چراغ پا ہو گئی۔ غصے میں اس کے قریب پہنچی اور اس کے کولہے پر کھجور کی چھڑی سے آہستہ آہستہ مارنے اور غصے میں کہنے لگی "بدتم چرب زبان اور باتونی ہونے کے ساتھ ساتھ غبی بھی ہو، کم عقل اور کند ذہن بھی ہو، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اپنی گرانمایہ خدمات کے صلے میں اگر مجھے مانگو گے تو میں تمہیں بخش دی جاؤں گی، یہ کس طرح ہو سکتا ہے، میری خواہش اور میری مرضی کے خلاف ایسا کیونکر ممکن ہے میں تمہیں کس طرح قبول کر سکتی ہوں، میں ہیربد، مذہبی پیشوا کی بیٹی اور تم ایک کم رتبہ معمار، یہ فرق تو تحقیقی ہے اس

خلیج کو کس طرح پایا جا سکتا ہے!"

گلنار اسے کھجور کی چھڑی سے مار رہی تھی اور خوش نواز بجائے چوٹ کے لطف محسوس کر رہا تھا آخر کار سزا موقوف ہوئی اور گلنار نے اسے حکم دیا "اچھا اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

خوش نواز ڈرتے ڈرتے اٹھا اور نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ اب اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ کنکھیوں سے ہی گلنار کو دیکھ لیتا۔

گلنار نے کہا "آئندہ خبردار جو ایسی بات کی، ہمارے یہاں کی تقسیم جو اہوزامزاد کی قائم کردہ ہے وہی اس میں ردوبدل بھی کر سکتا ہے اور جب تک یہ ردوبدل نہیں ہوتا تمہیں میری خواہش نہیں کرنا چاہیے۔"

خوش نواز گلنار کا مفہوم نہیں سمجھ سکا، سادگی اور بھولے پن سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

گلنار کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی "تم خوش قسمت ضرور ہو اور ایسا لگتا ہے کہ اہوزامزدا تم پر مہربان ہے جب تمہارے ذمے کوئی غیر معمولی خدمت کی جائے تو تم اس کے صلے میں ہیربدوں کے طبقے میں داخل ہو جانے کی استدعا کر گزرنا۔ اگر موبد اعظم، شہزادے اور امرا نے تمہاری یہ استدعا قبول کر لی تو اس کے بعد تمہارے لئے ہر کام آسان ہو جائے گا!"

خوش نواز جیسے اچھل پڑا۔ گلنار نے اسے بڑے گر کی بات بتائی تھی۔

رات کو جب اسے آذر فرنگ کے بڑے ہال میں لے جایا گیا تو وہاں کا منظر ایسا نہ تھا کہ خوش نواز اس سے مرعوب نہ ہوتا۔ ولی عہد شہزادہ خسرو اور موبد اعظم برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے پندرہ امرا براجمان تھے، شہزادے کے کان اور گلے میں قیمتی زیورات پڑے ہوئے تھے اور اس کے لباس پر سونے کا کام بنا ہوا تھا۔ خوش نواز کو ایسا لگا جیسے تھوڑی دیر پہلے یہاں کوئی گرما گرم بحث ہو چکی ہے اور اسے دیکھتے ہی لوگ خاموش ہو گئے ہیں۔

ہیربد اسے مجرم کی طرح دونوں شانوں سے پکڑ کر موبد اعظم اور شہزادے کے قریب لے گیا اور امرا کے سامنے اس کا رخ کر کے کھڑا دیا۔

موبد اعظم نے حاضرین اور شہزادے کو مخاطب کیا "یہ نوجوان نگردین دار معمار جو سلوکیا سے تیسفون آیا ہے اپنے کام میں یکتا اور دیانت دار واقع ہوا ہے، ہیربد نے اسے اچھی طرح جانچ پڑتال لیا ہے اور ذی شان کو یقین ہے کہ یہ ہمارے کام کو رازداری اور دیانت داری سے انجام دے گا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ دجلہ کے مغربی ساحلی شہر سلوکیا کا رہنے والا ہے اور تیسفون میں اس کے عزیز و اقارب نہیں رہتے چنانچہ تیسفون کے لوگ اسے نہیں پہچانتے۔"

اس کے بعد شہزادے اور امرا کی جسم و روح میں اتر جانے والی نظریں ایک ساتھ اس پر پڑیں۔
شہزادے نے ذی شان سے دریافت کیا "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ راز دار اور دیانت دار ثابت ہوگا؟"
"ذیشان نے فرمانبرداری سے اپنی گردن جھکا کر خوش نواز کی دیانت داری کی ضمانت لی اور عرض کیا:
"لیکن یہ بے زبان اور دین دار نوجوان یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اسے اس کی دیانت، محنت، راز داری اور خدمت کا کیا صلہ دیا جائے گا؟"
موبد اعظم نے اعلان کیا "یہ جس صلے کی بھی آرزو کرے گا عطا ہوگا!"
ذیشان نے خوش نواز سے دریافت کیا "بول تو اپنی عظیم خدمت کا کیا صلہ چاہے گا؟"
خوش نواز نے روہانسی آواز میں بدقت تمام دریافت کیا "خادم کو خدمت کی نوعیت سے مطلع کیا جائے۔ معلوم نہیں یہ ناچیز اسے انجام بھی دے سکے گا یا نہیں؟"
شہزادے نے موبد اعظم سے آنکھ کے اشارے سے کچھ کہا۔ وہ کہنے لگا "شاہی قصر کے پیچھے جو میدان ہے اس میں تین تین ہاتھ چوڑے تین ہاتھ لمبے اور تقریباً تین ہی ہاتھ گہرے کئی ہزار گڑھے کھودنے ہیں۔ اس کام کے لیے تمہیں کئی مزدور بھی دیے جائیں گے تم انہیں اپنی نگرانی میں کھدواؤ گے۔ گڑھوں سے نکلنے والی مٹی گڑھوں کے آس پاس ہی موجود رہے گی، سر دست تمہیں اتنا ہی کام انجام دینا ہے یہ گڑھے بہت اچھے اور یکساں ہونے چاہئیں!"
خوش نواز نے آہستہ سے کہا "یہ تو بہت ہی آسان کام ہے یزداں نے چاہا تو توقعات سے بہتر یہ انجام پائے گا۔"
موبد اعظم نے کہا "اس خدمت کے بدلے میں تم کیا لینا پسند کرو گے؟"
خوش نواز نے عرض کیا "ہیربد کے اعلیٰ طبقے میں داخلہ اور شمولیت!"
اس صلے پر سبھی چونک پڑے، موبد اعظم نے کچھ عجیب سی نظر سے ذیشان کو دیکھا اور ذیشان حیرت اور پریشانی سے خوش نواز کو دیکھ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم دیا جیسے وہ تھک کر چکنا چور ہو چکا ہے اور اس کے پیروں کی طاقت سلب ہو چکی ہے۔

⁂ ⁂

کمرے میں کئی موٹی شمعیں جل رہی تھیں، ان کی روشنی میں ذیشان اور خوش نواز فکر مند اور اداس بیٹھے تھے، ذی شان اداس بھی تھا اور غضبناک بھی، موبد اعظم، شہزادہ خسرو اور معزز امرا نے خوش نواز کو ذی شان کی نگرانی میں دے دیا تھا، اسے ایک نہایت اہم خدمت انجام دینی تھی اس وجہ سے ذیشان بے بس ہو گیا

تھا۔ ورنہ خوش نواز نے مجلس شوریٰ کے سامنے جس صلے کی خواہش کی تھی، اس سے ذیشان بڑا فروختہ تھا وہ کوشش کے باوجود جوش پر قابو نہ پاسکا۔ خوش نواز کو تلخ لہجے میں مخاطب کیا ”تم نے اپنی خدمت کے صلے میں جو کچھ مانگا ہے میں اس کے پس منظر کو سمجھنا چاہتا ہوں، تم ہیر بدوں کے طبقے میں داخلہ چاہتے ہو لیکن میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ آخر کیوں تمہیں یہ ہیر بدہی کیوں پسند آئے آخر؟“

خوش نواز کے پاس ان باتوں کا کوئی معقول جواب نہ تھا، وہ خاموش رہا تو ذیشان نے پھر اسے چھیڑا اور اس بار اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ تند اور تلخ تھا ”تمہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ اگر تم ہیر بدوں میں شامل بھی ہو گئے تو اس شمولیت کو ہم دل سے کس طرح قبول کر لیں گے، ہم کسی طرح اپنی اولادوں کی شادیاں تم میں نہیں کریں گے، ہم جہاں اور جو کچھ ہو وہیں بہت اچھے لگتے ہو اور ہم جہاں اور جو کچھ ہیں وہیں اچھے اور خوب ہیں یہ میری مہربانی ہے کہ تم کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور تمہاری یہ ہمت کہ تم ہمیں پر کمندیں پھینکنے لگے، سن لو غبی انسان! تم کسی بھی رتبے پر پہنچ جاؤ لیکن تم گلنار کو نہیں پا سکتے۔“

خوش نواز نے لفظوں کا یہ زہر بھی پی لیا اور خاموش رہا۔ ذیشان نے مزید کہا ”میں کل کول جا رہا ہوں۔ ممکن ہے تمہیں بجا آوری خدمت کے بعد مطلوبہ مقام حاصل ہو جائے۔ اس وقت ہم دونوں الگ الگ ہو جائیں گے کیونکہ کم از کم میں یہ برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوں، تمہارا طبقہ تمہارے لیے اور ہمارا طبقہ ہمارے لیے، اسے مت چھیڑو۔“

خوش نواز بدستور خاموش رہا لیکن ذیشان کی باتیں برابر اس کے دل کا خون کیئے دے رہی تھیں۔ ذیشان نے اس اداس اور مجبور نوجوان کو اپنا آخری فیصلہ سنا دیا ”تم! کیا نام ہے تمہارا؟ خوش نواز! تو میں کہہ رہا تھا کہ کل سے تم اپنا کام شروع کر دینا، میں کول جا رہا ہوں، امروکیت کا کھیل بہت جلد ختم ہونے والا ہے جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، تم گلنار سے نہیں ملو گے، سمجھے؟“

خوش نواز نے ڈر کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

بعد میں ذیشان کول روانہ ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں ولی عہد شہزادہ خسرو خوش نواز کو اپنے ہمراہ محل کے عقبی حصے میں لے گیا، وہاں دو سو مزدور اس کے منتظر تھے خوش نواز نے مستعدی اور محنت سے اپنا کام شروع کر دیا اور گڑھے کھودے جانے لگے، اب خوش نواز کو اپنے کام سے کام تھا وہ لوگوں سے بہت کم باتیں کرتا۔ آذر فرونگ کے جس حصے میں چلتے وقت ذیشان اسے ٹھہرا گیا تھا وہ ہیر بدوں کے مکان سے ذرا دور تھا۔

سورج غروب ہو جانے کے بعد چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تو ایک دبیز چادر میں لپٹی لپٹائی منہ

چھپائے گلنار اس کے پاس پہنچی اور اس سے دُور دُور رہنے کا سبب دریافت کیا۔ خوش نواز نے ذیشان کی پوری گفتگو سے اسے آگاہ کر دیا تو گلنار بددل ہو کر بولی "بددین والوں کی یہی بداخلاقیاں ہی تو ہیں جن سے نوجوان اور نادار طبقہ ہراساں ہے تم ان باتوں کی پرواہ نہ کرو اور اپنے کام سے لگے رہو۔ مستقبل کیا فیصلہ کرے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا یا اہورامزدا خوب جانتا ہوگا!"

خوش نواز نے پہلی بار اس کا نام لیا۔ بولا "بیٹھئے گلنار!"

گلنار نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ کہنے سے بیٹھی نہیں، کھڑے کھڑے ذرا اٹھلا کر بولی "بس ملیں گی۔ بابا جان معلوم نہیں کیا سوچتے ہیں، رنسی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تم شریف و دیندار لوگ گھڑی دو گھڑی کے لئے آجاتے تھے تو دل بہل جاتا تھا اب وہ اس پر بھی پابندی لگا دینا چاہتے ہیں" پھر سوال کیا "تم نے ان سے کسی قسم کا مطالبہ تو نہیں کر دیا تھا؟"

"نہیں" خوش نواز نے جواب "لیکن آپ کی ایما اور مشورے پر جب میں نے اپنی خدمات کے صلے میں مہر بدلیں شمولیت کا مطالبہ کیا تو آپ کے والد کچھ سوچ کر بھڑک گئے"

گلنار نے اسے تسلی دی، کہنے لگی "تم مایوس نہ ہو اہورامزد جو کرے گا بہتر کرے گا، جو کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے اسے دلچسپی اور محنت سے جاری رکھو"

"آپ بیٹھتیں کیوں نہیں!" خوش نواز کہنے لگا "مجھے آپ کے کھڑے رہنے سے تکلیف محسوس ہو رہی ہے!"

گلنار ذرا تکلف سے اس طرح بیٹھی کہ اس میں کھڑے ہونے اور بیٹھنے کا انداز مساوی پایا جاتا تھا۔

خوش نواز کہنے لگا "گلنار! جب سے میں نے آپ کے والد سے یہ سنا ہے کہ اگر میں اپنی زبردست کوشش اور محنت سے مہر بدوں میں داخل بھی ہو گیا تب بھی لوگ ذہنی اور عملی طور پر مجھے قبول نہ کریں گے تو میرا دل الجھنے لگتا ہے اور مستقبل میں دور تک تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں نظر آتا۔ دل بھٹکنے لگتا ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ مزدک کی مزدکیت جو طبقات کی قائل نہیں اور انسانی مساوات کی پیامبر ہے یہ اس دور کا عظیم دین ہے۔"

گلنار پریشان ہو گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، آزردگی سے کہنے لگی "لیکن تم ابھی یہ مت سوچو، کچھ ٹھہر و، موقع دو، میرا خیال ہے باوامان کی ذہنی حالت ہمیشہ ایسی ہی نہیں رہے گی، وہ بدل جائیں گے یا بدل دیئے جائیں گے۔"

خوش نواز مایوسی سے بولا "انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن انسانوں کے ذہن اور طبقاتی روایات میں ہنگامہ خیز بنیادی تبدیلیاں کوئی پیغمبر ہی لا سکتا ہے، عام انسان نہیں اور مزدک غالباً اسی طرح اہورامزدا کی طرف سے ہم انسانوں میں بھیجا گیا ہے"

گلنار کھڑی ہو گئی اور کچھ ناراض سی ہو کر بولی "اب تک تو میں نے تمہیں دین دار ہی سمجھا تھا لیکن اس وقت کی باتوں سے تم کچھ کچھ گمراہ اور شکی محسوس ہونے لگے ہو۔ عقیدے اور دین کے معاملے میں تم آزاد ہو لیکن چلتے چلتے میں تم سے یہی کہتی جاؤں گی کہ ذرا انتظار کر لو۔ کسی کی طرح بے دین اور گمراہ نہ ہو جاؤ۔"

گلنار نے خوش نواز کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور تیزی سے نکل گئی۔

⁂

خوش نواز کئی دن مسلسل سلوکیا نہیں جا سکا۔ پچاس پچاس گڑھوں کی دو سو چالیس قطاریں تیار ہو چکی تھیں وہ تھک گیا تھا۔ ولی عہد شہزادہ خسرو، موبد اعظم کے ہمراہ ان گڑھوں کے معائنے کو آیا تو ان گڑھوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور خوش نواز کو بڑی شاباشی دی اور اس کی پشت تھپتھپاتا ہوا بولا "میں تم سے بہت خوش ہوں، عنقریب تم یہاں ایک شاندار باغ اگا ہوا دیکھو گے۔" پھر موبد اعظم کو مخاطب کیا "حضرت موبد موبدان! میں سفارش کرتا ہوں کہ اس نوجوان کو ہیربدوں میں شامل ہو جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔"

موبد اعظم نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور گھنی مونچھوں میں چھپے ہوئے ہونٹوں کو حرکت دی "ہر چند کہ کوئی ایسا قانون بہ دین میں موجود نہیں جس کی رو سے ایک معمار ہیربدوں میں داخل کیا جا سکے لیکن اس نوجوان کی غیر معمولی محنت اور عظیم خدمت کے پیش نظر بہ دین کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی اور گنجائش پیدا کی جائے گی۔" پھر خوش نواز کو تسلی دی کہ "جب یہ گڑھے اپنا مقصد حاصل کر چکیں گے تو اے نوجوان تم ہمارے پاس آذر فرونگ میں آ جانا۔ میں تمہیں ہیربدوں میں داخل کرا دوں گا!"

خوش نواز اس مژدۂ جانفزا سے خوش نہیں ہوا۔ اس موضوع کو تقریباً نظر انداز کر دیا اور شہزادہ خسرو سے سلوکیا جانے کی اجازت طلب کی۔ "عالی قدر شہزادے! یہ خادم کئی دن سے وطن سلوکیا نہیں گیا ہے، کیا گھڑی دو گھڑی کے لیے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی؟"

شہزادے نے موبد اعظم کو دیکھا۔ موبد اعظم نے عرض کیا "کوئی حرج نہیں بشرطیکہ نوجوان کو چند سپاہیوں کی نگرانی میں سلوکیا روانہ کیا جائے اور اسے مقدس آگ کو ہاتھوں میں لے کر یہ قسم کھانی پڑے گی کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان قابو میں رکھے گا۔"

اسی وقت وہیں مقدس آگ بھی فراہم کر دی گئی اور خوش نواز کو مٹی کے کوزوں میں رکھ کر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھانا پڑا۔ اس نے سات بار رازداری کی قسم کھائی۔ شہزادے خسرو اور موبد اعظم نے اسے سلوکیا جانے کی اجازت دے دی، دو سپاہی ساتھ کر دیئے گئے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ انہیں جیسے ہی یہ معلوم ہو کہ خوش نواز نے کوئی زبان کی

بات اگلی ہے اسے فوراً ہلاک کر دیا جائے۔

دجلہ کے مشرقی ساحل سے شاہی کشتی خوش نواز کو سپاہیوں کی نگرانی میں لے کر سلوکیا کی طرف روانہ ہو گئی گھر پہنچ کر خوش نواز کو ایک نہایت منحوس خبر سننے کو ملی۔ اس کے گھر کا چھوٹا سا آتشکدہ بجھ چکا تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ اس پر کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے، وہ اتنا پریشان اور دل گرفتہ ہوا کہ آتشکدے کو دوبارہ روشن کئے بغیر ہی واپس آ گیا دونوں سپاہی اس کے ساتھ تھے جو کشتی لائی تھی وہی اسے دوبارہ ٹیسفون واپس لے گئی۔ وہ ٹیسفون کے ساحل پر اتر کر آذر فرنبغ کے اس حصے میں گیا جہاں ایک کوٹھری میں وہ ٹھہرا ہوا تھا، وہیں اسے یہ خبر ملی کہ ذیشان واپس آ چکا ہے، اس کے ساتھ کول کا موبد اعظم آذر مہر بھی آ گیا ہے۔ آتش کدے کے بجھ جانے کی بدشگونی نے اسے بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا، وہ اتنی ہمت بھی نہ کر سکا کہ جا کر ذیشان سے مل ہی آتا۔

دوسرے دن صبح جب وہ ذی شان سے ملنے گیا تو وہ بہت تپاک سے پیش آیا اور یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی ذیشان ہے جس نے اسے کول جانے سے پہلے بہت مایوس کیا تھا اسے حیرت ہوئی، اس وقت اٹھارہ سالہ شہزادہ خسرو بھی ایک عام نوجوان کی طرح ذیشان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ گلنار بھی وہیں موجود تھی، وہ خوش نواز کو دیکھتے ہی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ شہزادے نے خوش نواز کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے کہا "نوجوان معمار! انصاف جو اہورا مزدا کا وصف ہے اس سے تمہیں ضرور نوازا جائے گا اور تمہیں حسب وعدہ ہیربدوں کے طبقے میں داخل کر لیا جائے گا۔"

خوش نواز نے بجھے دل سے جھک کر عرض کیا۔ "عالی قدر شہزادے! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہو گی اور یہ غلام اس کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہے۔"

شہزادے نے ذیشان سے پوچھا "ہیربدوں میں شمولیت پر تمہیں تو کوئی اعتراض نہ ہو گا؟"

ذیشان نے گردن کو نفی میں ہلایا اور آہستہ سے کہا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، جب آپ کو یا حضرت موبد اعظم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو مجھے کوئی اعتراض کیونکر ہو سکتا ہے؟"

شہزادے نے خوش نواز سے کہا "امید ہے کل شام تک تم ہیربدوں میں شامل کئے جا چکے ہو گے۔"

پھر شہزادے نے گلنار کی طرف دیکھا اور ذی شان سے کہا "آج دربار میں جو تماشا ہو گا کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم اپنے ہمراہ گلنار کو بھی لیتے آؤ!"

خوش نواز کا ماتھا ٹھنکا اور وہ کسی قدر خوفزدہ ہو گیا ذی شان نے جواب دیا "ضرور شہزادے کی خواہش کی تعمیل ہو گی۔"

"اور تم معمار تم!" شہزادہ خوش نواز سے مخاطب ہوا "تم بھی آ جانا اور اپنی محنت کے ثمرے کو اتنی

جلد بلا آور ہوتے بھی دیکھ لینا۔" پھر ذیشان کو حکم دیا "اس معمار کو بھی ساتھ لیتے آنا۔" جب شہزادہ چلا گیا تو ذی شان نے خوش نواز سے کہا "شہزادہ تمہارے کام سے بہت خوش ہوا ہے۔" پھر آپ ہی آپ کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔ بولا "اور میں خود بھی آج بہت خوش ہوں، اے آذر خش (مقدس آگ) میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں تو نے میرا بوجھ اُتار دیا مجھے ہلکا کر دیا۔" پھر اس نے اپنے شانے اچکائے اور فرط خوشی سے چیخا "اب میں اپنے آپ کو اتنا ہلکا محسوس کر رہا ہوں کہ اگر چاہوں تو ہوا میں پرواز کر سکتا ہوں!" اس نے گلنار کی طرف دیکھا اور اسے مبارک باد دی۔ اہورا مزدا جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے نرسی گیا تو اس کی جگہ شہزادہ لینے کو آمادہ ہو گیا اور یہ ہماری تمہاری دین داری اور آذر پرستی کا انعام ہے، آہ میں کتنا ہلکا ہو گیا ہوں، بے حد ہلکا۔"

اب خوش نواز سب کچھ سمجھ چکا تھا، اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ کوئی دل مسلنے لگا۔ وہ انتہائی ضبط کئے بیٹھا رہا۔ آخر ذیشان نے اس کے سکوت کو توڑا "پھر صاحبزادے شام تک تیار ہو جانا، دربار ساتھ ہی چلنا ہے، ایک عجیب و غریب تماشا ہونے والا ہے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا!"

خوش نواز نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ اُٹھا اور کسی قسم کی بات کئے بغیر چلا آیا۔ چلتے وقت اس نے ایک اچٹتی نظر گلنار پر ڈالی جو بیٹھی حسرت سے اسے تک رہی تھی اور بہت مغموم نظر آتی تھی۔

جب ذیشان موبد اعظم کے ساتھ، کول کے موبد اعظم آذر مہر کو لے کر شاہی محل چلا گیا تو لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی، چادر میں جسم اور منہ چھپائے گلنار خوش نواز کے پاس پہنچ گئی۔ کوٹھری اندر سے بند تھی۔ گلنار نے اسے آہستہ آہستہ تھپتھپایا۔ تھوڑی دیر بعد کوٹھری کا دروازہ کھل گیا۔ گلنار نے دیکھا خوش نواز کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے، گالوں پر گیلی گیلی کئی لکیریں پڑیں ہوئیں تھیں، پپوٹے بھاری اور آنکھیں سرخ تھیں، گلنار کا دل بھر آیا۔ آواز حلق میں پھنس پھنس کر نکلی "کیا ابھی تم رو رہے تھے؟"

خوش نواز نے کوئی جواب نہ دیا، بس صورت دیکھتا رہا۔

گلنار نے اسے بے تکلف کرنا چاہا "تم مجھ سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہہ رہے ہو، کیا میں چلی جاؤں؟"

خوش نواز نے اسے اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو "جا سکتی ہو!"

گلنار نے کہا "لیکن میں کچھ باتیں کرنے آئی ہوں، باتیں کر کے ہی واپس جاؤں گی"

خوش نواز نے تقریباً روتے ہوئے کہا "گلنار! سب کچھ ختم ہو چکا!"

"کیا ختم ہو چکا؟" گلنار نے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

خوش نواز نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کی، کہنے لگا "گلنار! مجھے معاف کرنا، اس وقت میں

آداب اور تکلفات کے بغیر تم سے باتیں کروں گا اور اب چونکہ میں اب اپنی زندگی کو بھی عزیز نہیں رکھتا اس لیے جو کچھ کہوں گا اس میں مصلحت اندیشی کو ذرا سا بھی دخل نہ ہو گا!"

گلنار ایک تپائی پر بیٹھ گئی اور بولی "کہو جو کہنا ہے صاف صاف بے تکلف کہو!"

خوش نواز کہنے لگا "جب میں نے تمہیں پہلی بار آتش کدے میں گریہ اور مناجات کرتے دیکھا تھا تو مجھے تم پر بڑا رحم آیا اور تمہارے لیے میرے دل میں بس اتنی سی خواہش تھی کہ کس طرح تمہاری مصیبتوں سے آگاہ ہو جاؤں اور اگر ممکن ہو تو اس سلسلے میں تمہاری مدد بھی کر دوں لیکن جب جدا ہونے کے بعد کافی دنوں تک تم سے نہ مل سکا تو میں نے اپنے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کی اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں اسی دن آتش کدے میں اپنا سب کچھ ہار چکا تھا اور تم سے محبت کرنے لگا تھا۔"

پھر ذرا دیر کے لیے رکا اور دم لے کر بولا "گلنار! چونکہ جذبے پر کسی کو اختیار نہیں اس لیے مجھے کہنے دو کہ میں تمہاری پہلی ہی نظر میں تمہارا اسیر ہو گیا تھا۔ پھر بعد میں جب مجھے نرسی کی بابت علم ہوا تو مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ مزدکی ہو چکا ہے اور تم اور تمہارے والد اس مزدکی سے کسی قیمت پر بھی یہ رشتہ کرنے کو تیار نہیں، میں دل ہی دل میں اہورا مزدا سے یہ دعا مانگتا رہا کہ وہ نرسی کو گمراہ اور بے دین ہی رکھے کیونکہ اس طرح میں دیندار اور شریف بن کر تمہاری قربت اور بعد میں محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ حالات میری مرضی اور خواہش کے مطابق بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ تم نے نرسی کو مستقلاً دھتکار دیا اور میں کسی حد تک اس کی جگہ لے لینے میں کامیاب ہونے لگا۔ اس دوران میری بابت تمہارا رویہ مشتبہ اور غیر یقینی سا رہا لیکن آخر میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ کسی حد تک تم بھی میری طرف ملتفت ہو چکی ہو، پھر جب تم نے مجھے مشورہ دیا کہ میں شہزادے اور موبد اعظم کی عظیم الشان خدمت انجام دینے کے بعد، اس کے صلے میں ہیربدوں کے طبقے میں شمولیت کا انعام مانگوں تو مجھے اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ تم بھی مجھے چاہنے لگی ہو اور تمہارا یہ مشورہ اسی محبت کے پیش نظر ہے" یہ کہتے کہتے اس نے گلنار کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا وہ ٹھوڑی ہتھیلی پر لیے چپکے چپکے بیٹھی رو رہی ہے آنسو بہہ بہہ کر ٹھوڑی کے چاہ ذقن میں جمع ہو کر سینے پر ٹپک رہے تھے "تم کیوں روتی ہو گلنار! پہلے میری پوری بات تو سن لو جب میں تمہاری خاطر اپنی سیاسی مشکلات پر قابو پاتا چلا گیا اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ میں ہیربدوں کے طبقے میں داخل کر لیا جاؤں گا تو اچانک تمہارے باپ نے میرے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا اور میں ایک بار پھر امید و بیم کے درمیان معلق ہو گیا۔ پھر جب میں اپنے فرائض منصبی بخیر و خوبی انجام دے کر کئی دن بعد اپنے گھر سلو کیا گیا تو وہاں مجھے ایک انتہائی نحوست اور ناشدنی کا سامنا کرنا پڑا" پھر ذرا رک کر افسردگی سے بولا۔

"وہاں میری زندگی کی بدترین اور مہیب ترین بدشگونی میرا انتظار کر رہی تھی۔ افسوس کہ جب میں گھر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میرے گھر کا آتش کدہ آپ ہی آپ بجھ چکا ہے۔ میرا دل اسی وقت بیٹھنے لگا تھا اور میں نے یقین کر لیا تھا کہ اس کی نحوست کہیں ظاہر ہو یا نہ ہو لیکن میرے معاملاتِ قلب میں ناکامی کی صورت میں قطعی رونما ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔" پھر اس نے آہستہ سے دریافت کیا "کیا ولی عہد شہزادے خسرو نے تمہیں پسند کر لیا ہے؟"

گلنار نے روتے ہوئے کہا "لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی، میں اسے کس طرح پسند کر سکتی ہوں خوش نواز۔ وہ اپنے باپ قباد کے بعد بادشاہ ہو جائے گا اور اپنے حرم کو خزانے کی طرح عورتوں سے بھرنے لگے گا۔ اس ذخیرے میں کہاں ہوں گی، کوئی نہیں جانتا۔ اس وقت میں تمہارے پاس اسی لیے تو آئی ہوں کہ تم مجھے کوئی مشورہ دو کہ ان حالات میں، میں کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے میری عقل کام نہیں کرتی۔ کاش تم نہ آتے اور نرسی بے دینی کی طرف مائل نہ ہوتا۔"

خوش نواز نے مایوسی سے جواب دیا۔ "جب اہورامزدا نے یہ طے کر دیا ہے کہ تم اس ملک کی ملکہ بنائی جاؤ تو کون ہے جو اس کے اس فیصلے کو بدل دے۔"

گلنار نے نفرت سے کہا "مجھے ملکہ نہیں بننا ہے، میں معمولی عورت ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اب میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں خوش نواز کیا تم اتنی عقل بھی نہیں رکھتے کہ کوئی ایسی بات سوچ سکو جس سے ہم دونوں خوشی خرمی کی زندگی گزار سکیں۔"

خوش نواز کے دل میں امید کی ہلکی سی کرن پیدا ہوئی۔ اس نے کہا "آج شام کو دربار میں کیا پیش آتا ہے؟ پہلے یہ دیکھ لیا جائے۔ سنتا ہوں کول کے موبدِ اعظم آذر مہر اور مزدک پیغمبر میں کوئی مناظرہ ہونے والا ہے اگر موبدِ اعظم ہار گیا تو ظاہر ہے اپنے باپ قباد کی طرح شہزادہ خسرو بھی مزدکی ہو جائے گا اور جب سرکاری مذہب ہی مزدکی قرار پا جائیگا تو معلوم نہیں اس وقت ملک میں کیسے قوانین رائج کئے جائیں، اگر مزدکیت آگئی تو دولت اور عورت کا حق ملکیت خود بخود ختم ہو جائے گا۔ طبقات ختم ہو جائیں گے اور شاید اس وقت ہم دونوں بھی اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

گلنار نے سرکشی سے کہا "اگر مزدکیت آگئی اور ایران کا سرکاری مذہب مزدکیت قرار پا گیا تو میں خودکشی کر لوں گی، میں مر جاؤں گی لیکن اپنی ذات پر ہر مرد کا حق نہ تسلیم کروں گی۔"

گلنار کی جذباتی گفتگو پر خوش نواز نے کھوکھلا قہقہہ لگایا اور جوئے میں سب کچھ ہار جانے والے جواری کی طرح بولا "گلنار! تمہاری خودکشی سے یہ آنے والا طوفان تو نہیں رک جائے گا۔ امید کا چراغ

جو مزدک کے دم سے روشن ہے اسے کوئی بھی نہ بجھا سکے گا۔ اب چاروں طرف، دور دور تک، حال سے لامتناہی مستقبل تک انتشار ہی انتشار ہے۔ اگر اس میں جیت بادشاہت کی ہوئی تو کوئی خوش نواز کسی گلنار کو حاصل نہ کر سکے گا۔ کیونکہ یہ گلنار غریب معماروں کے کلبۂ احزاں کے لیئے نہیں شاید شاہی محلوں کے لیے پیدا ہوئی ہے! تم خودکشی کر کے شہزادہ خسرو کے حرم میں داخل ہونے سے بچ جاؤ گی لیکن اس سے میرے نہاں خانۂ دل پر ایک قیامت گزر جائے گی۔"

گلنار اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی تھی، گردن جھکائے کچھ سوچتی اور آنسو بہاتی رہی، اس کا سر گھٹنوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور آنسوؤں کے قطرے اس کے اپنے قدموں میں سامنے ٹپک ٹپک کر مٹی میں جذب ہو رہے تھے، پھر اسے اچانک نہ جانے کیا خیال آیا وہ اٹھی اور اس نے اپنی آغوش وا کرتے ہوئے خوش نواز سے کہا "خوش نواز! اب ان باتوں کو دل میں چھپائے رکھنے سے کیا حاصل؟ میں نے بہت پہلے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کل کیا ہو۔ آؤ آج میرے گلے لگ جاؤ۔ میرے رخسار تمہارے سامنے ہیں میرے بوسے لو تاکہ تمہارے دل میں یہ حسرت باقی نہ رہے کہ تم اتنی شدتوں کے باوجود بھی مقدس ہیر بد کی بیٹی سے ذرا سی قربت تک نہ حاصل کر سکے، آؤ میرے پہلو سے لگ جاؤ اور یقین کر دو کہ میں نے تمہیں اپنے طبقے حرمت اور عظمت کے باوجود تمہارے جذبوں کی کامیابی کی سند دی ہے۔"

خوش نواز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گلنار کی صورت تکتا رہا جیسے کہہ رہا ہو "خوب! تم نے میرے عشق کا کتنا معمولی صلہ تجویز کیا ہے؟" وہ کچھ نہ بولا آنسو بہاتا رہا۔

اور گلنار اسے روتا ہوا چھوڑ کر رخصت ہو گئی۔

⁂

بادشاہ قباد اور شہزادہ خسرو کول کے موبد اعظم آذر مہر، موبد اعظم ـــ ذیشان خوش نواز کے درمیان یک ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس پردے سے تقریباً دس ہاتھ دور یہ لوگ کھڑے تھے، گلنار کو خواتین کے حصے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اچانک ریشمی پردے کو حرکت ہوئی اور وہ ایک طرف کھسکتا چلا گیا اس کے اندر پردے سے تقریباً دس ہاتھ دور ایک مرصع تخت پر بادشاہ قباد بیٹھا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ایک مرصع اور مطلا پر ایک دوسرا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ خوش نواز نے قیاس سے پہچان لیا کہ یہ دوسرا بوڑھا مزدک ہی ہے، مزدک کے چہرے کی معصومیت بتا رہی تھی کہ یہ شخص بنی نوع انسان کا دشمن قطعی نہیں ہو سکتا۔

اسی لمحے شاہی محرم باش کی آواز سنائی دی "ادب سے بات چیت کرو کیونکہ اب تم بادشاہ کے

حضور میں ہو"
لوگ سمجھ گئے کہ اب موبد اعظم آذر مہر اور معاشی اور سماجی مصلح، مزدک میں مناظرہ ہونے ہی والا ہے۔
موبد اعظم آذر مہر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مزدک سے پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ تم نجی اور انفرادی املاک کے حق کو ختم کرنے آئے ہو؟"
"ہاں!" مزدک نے دو ٹوک جواب دیا۔
"اچھا۔" آذر مہر بولا "اگر تمہارے معاشی اصول کو مان لیا جائے تو تمہارے مذہب میں کنوئیں، سرائیں اور درس گاہوں کا ثواب کس کو ملے گا کیونکہ نجی ملکیت کا تو سوال ہی ختم ہو چکا ہوگا!"
"اگر انسان خوش حال ہو تو پھر اسے کسی اور ثواب کی ضرورت ہی کب رہتی ہے!"
"اچھا چھوڑو اسے بھی چھوڑو، اب تم یہ بتاؤ کہ اگر عورتوں کے بارے میں تمہارے مذہب کے کے اصول اور قوانین مان لیے جائیں تو اس میں ایک بڑی قباحت پیدا ہوتی ہے، اس وقت چونکہ بادشاہ کی ملکہ بھی اسی اصول کے تحت بے شمار مردوں سے تعلقات رکھے گی ان حالات میں اس سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کا باپ کسے مانا جائے گا اور حکومت اور اثنا کس کے حصے میں جائے گی؟"
درباریوں نے سمجھا کہ اب مزدک لاجواب ہو چکا ہے لیکن مزدک نے فوراً جواب دیا "جس طرح میں ذاتی ملکیت کو برا سمجھتا ہوں اس طرح میں حکومت کو بھی برا اور قابلِ مذمت سمجھتا ہوں لیکن چونکہ انسان پیدائشی خود غرض ہے اور یہ اپنی خود غرضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تو ہمیں اس وقت حکومت جیسی برائی کو گوارا اور برداشت کر لینا چاہیے لیکن اس حکومت کو اتنا اہم بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ آنکھیں بند کر کے اس کے ہر اچھے برے فعل کی تائید کی جائے"
آذر مہر نے کہا "جناب میرے سوال کا جواب نہیں ملا"
"سوال پھر سے دہراؤ!"
"آپ کے مذہبی معاشرے میں جہاں عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے آزاد ہوں گے وہاں بادشاہ کی اولاد کا تعین کس طرح ہوگا؟"
"اس کا فیصلہ بچوں کی اہلیت اور صلاحیت پر ہوا کرے گا!"
آذر مہر نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا "تو گویا میں یہ یقین کر لوں کہ جناب نے اس خطۂ ارض پر اس لیے نزولِ اجلال فرمایا ہے کہ تمام طبقات، خاندانی روایات اور طبقہ واری شرافت اور نجابت کا قلع قمع کر دیا

جائے؟"

"بالکل بالکل!" مزدک نے کہا "میں طبقات اور ان کی روایات کا قلع قمع کرنے آیا ہوں!"

آذر مہر نے غیر متوقع اعلان کر دیا "مزدک اہورامزدا کا بھیجا ہوا۔ زرتشت پیغمبر ہے میں اس سے مناظرہ کرنے کی خود میں طاقت نہیں محسوس کرتا۔"

شہزادہ خسرو گھٹنوں کے بل جھک گیا اور مزدک کے روبرو آداب بجا لایا۔ باآواز بلند عرض کیا "جناب والا! چونکہ مناظرے میں موبد اعظم آذر مہر کو شکست ہو گئی ہے اس لیے میں اپنے مزدکی ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔"

مزدک کا چہرہ خوشی سے باغ باغ ہو گیا "شہزادے! تم ولی عہد ہو اور تمہارے مزدکی ہو جانے سے اس نئے دین کو بڑی مدد اور شہرت حاصل ہو گی تمہاری وجہ سے اسے قبولیت عامہ کا مقام حاصل ہو گا!"

نقارے پر چوٹ پڑی گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ شہزادہ خسرو نے دین مزدکیت قبول کر لیا ہے۔

شہزادہ خسرو اپنے باپ سے مخاطب ہوا "قبلہ عالم! چونکہ اس خاکسار نے دین مزدکیت اختیار کر لیا ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس ناچیز کو فوجوں کی کمان دے دی جائے تاکہ یہ اس کی مدد سے مزدکیت کی ترویج و اشاعت کا کام شروع کرے۔"

اور اسی وقت بادشاہ قباد کی طرف سے یہ اعلان ہو گیا کہ آج سے شہزادہ خسرو تمام افواج شاہی کا سپہ سالار مقرر کیا جاتا ہے۔"

دربار میں ادھر ادھر متعین فوج نے شہزادے کو زوردار سلامی دی۔

شہزادے نے مزدک سے کہا "جناب والا! آج میں تمام ہم مذہبوں کو قیمتی خلعتوں اور ہتھیاروں سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ انہیں حکم دیں کہ وہ بیس بیس کی ٹولی میں محل کے عقبی حصے میں پہنچیں وہاں انہیں خلعتیں اور ہتھیار پیش کیے جائیں گے، سب کے آخر میں آپ خود تشریف لے چلیں گے اور ان کا شاندار نظارہ فرمائیں گے!"

مزدک نے اپنے ماننے والوں کے نام یہ فرمان جاری کر دیا کہ شہزادے کے آدمیوں کی مدد سے وہ محل کے پچھلے حصے میں بیس بیس کی تعداد میں پہنچیں اور وہاں سے اپنے حصے کی خلعتیں اور ہتھیار حاصل کریں۔"

اور اس حکم پر فوراً ہی عمل درآمد شروع ہو گیا۔

شہزادہ خسرو، موبد اعظم آذر مہر، موبد اعظم تیسفون، ذی شان اور خوش نواز محل کے عقبی حصے میں پہنچ گئے وہاں سو مسلح سپاہی آنے والوں کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے یہ بیس بیس کی ٹولی ایک تنگ دروازہ

سے گزر کر جیسے ہی گڑھے والے حصے میں داخل ہوتی۔ مسلح سپاہی انہیں قابو میں کر لیتے اور پہلے تو انہیں بالکل برہنہ کر دیتے اس کے بعد انہیں سر کے بل گڑھے میں اس طرح دفن کر دیتے کہ ان کی دونوں ٹانگیں فضا میں بلند رہتیں اسی طرح یکے بعد دیگرے بارہ ہزار آدمیوں کو اٹھا اٹھا دفن کر دیا گیا۔ سب سے آخر میں خود مزدک بادشاہ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا وہاں پہنچا اسے بھی سپاہیوں نے اپنی گرفت میں لے لیا شہزادہ خسرو اس کے قریب پہنچا اور طنز سے کہنے لگا۔ جناب والا! جس قوم کے آپ پیغمبر ہیں ہم نے ان سے یہ ایک باغ تعمیر کیا ہے امید ہے کہ آپ بھی اسے پسند فرمائیں گے۔ اس کے بعد سپاہیوں کو حکم دیا کہ مزدک کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے۔ مزدک چیخا۔ "دھوکا۔ فریب، دغابازی!"

سپاہیوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مزدک نے ہاتھ کے اشارے سے شہزادہ خسرو کو اپنے قریب بلایا اور کہا "اب جبکہ میں تمہارے مکر کی گرفت میں آچکا ہوں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، سنو میں کیا کہتا ہوں ـــــــ اور اسے گرہ میں باندھ لو!"

بادشاہ قباد کو مزدک کے اس حشر پر افسوس ہو رہا تھا لیکن فرح شہزادہ خسرو کے زیر اثر تھی صرف اتنا کہہ سکا "کیا تم اس بزرگ اور مقدس انسان کو بھی ہلاک کرا دو گے؟"

"ہاں شاہِ عالم!" شہزادے نے جواب دیا "اس بدبخت نے یہ کوشش کی تھی کہ مجھے اور میرے خاندان کو تاج و تخت سے محروم کر دے لیکن میں نے اسے ناکام بنا دیا۔"

مزدک نے کڑک دار آواز میں کہا "پہلے میری بات سن لو، ساسانی سلطنت کا تیرا دادا اردشیر کہا کرتا تھا کہ سلطنت کی بقا مذہب سے ہے اور مذہب کی ترویج و اشاعت بادشاہ کی قوت سے ہے، اس طرح ایک دوسرے موقع پر یہی بات اس نے اس طرح کہی تھی کہ مذہب اور تاج و تخت کو لازم و ملزوم سمجھو۔ دونوں ایک دوسرے کی بقا کا ذریعہ ہیں، جس کا کوئی مذہب نہیں وہ سفاک انسان ہے۔ شہزادے آج اس قول کے ایک حصے کی صداقت ہم سب کے سامنے ہے اور یہ کہنا کہ جس کا کوئی مذہب نہیں، وہ سفاک انسان ہے، بالکل غلط ہے اس کی مثال ہمارے سامنے ہے لیکن شہزادے! تم یہ بھی مت بھولو کہ میں صداقت ہوں، سچائی ہوں، تمہارے مار دینے سے میں مر نہیں سکتا۔ میں پھر واپس آؤں گا، ممکن ہے تم پھر مجھے ہلاک کر دو۔ لیکن میں پھر آؤں گا۔ اسی طرح جس طرح سچائی آتی رہتی ہے، میں اتنی بار آؤں گا کہ تم مجھ سے عاجز آجاؤ گے اور میرے رد برد خود کو بے بس اور مجبور محسوس کرنے لگو گے میں ذاتی املاک طبقات، روایات اور شاہی حسب نسب کے فخر کو ختم کر دینے میں بالآخر کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں مختلف شکلوں اور مختلف زمانوں میں آؤں گا اور ساری نوعِ انسانی پر چھا جاؤں گا۔"

شہزادے نے سپاہیوں کو آنکھ کا اشارہ کیا اور اسی لمحے انہوں نے مزدک کو بھی سر کے بل ایک گڑھے میں اُتار دیا اور اس طرح اشتراکیت کا یہ بڑا آدمی اپنی شخصیت، اپنے اصول اور نظریات ذہن میں چھوڑ کر ختم ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد محل کے عقبی حصّے کی دیواریں توڑ کر گرا دی گئیں اور تمام شہریوں کو اس باغ کی زیارت اور نمائش کے لیے اکٹھا کر لیا گیا۔

خوش نواز دل سوزی اور کوفت سے یہ سب دیکھتا رہا اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی محنت یوں ٹھکانے لگے گی۔ اگر مزدک زندہ رہتا تو شاید وہ بھی اس کے دین کو قبول کر لیتا۔ اس نے نرسی کو بھی کسی ایک گڑھے میں اُلٹا ہوتے دیکھا تھا، بارہ ہزار آدمیوں میں نرسی کو پہچاننا بہت دشوار تھا۔ مگر اس نے اسے پہچان لیا تھا۔

بانع بانع روشن روشن چہرے والے موبد اعظم آذر مہر، موبد اعظم تیسفون اور ذیشان کے ساتھ افسردہ افسردہ بجھا بجھا تھکا ہارا خوش نواز جب آذر فرونگ کی حدود میں گلنار کے در پر پہنچا تو اس وقت تک رتھ میں ذیشان، گلنار اور خوش نواز کے سوا کوئی بھی نہ رہ گیا تھا۔ ذیشان سے پہلے ہی خلافِ معمول کوچوان نیچے اترا اور ذیشان کو اُترنے میں مدد دینے لگا۔

لیکن اسی لمحے فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی کوچوان کا ہاتھ ذیشان کی پسلیوں سے اس طرح باہر آ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کا خنجر خون میں تر تھا اور وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے اپنے دخشور کا انتقام لے لیا۔ میں مزدکی ہوں اور مزدکی موت سے نہیں ڈرتے!"

دوسرا وار ممکن تھا خوش نواز پر ہوتا لیکن کوچوان نے خودکشی کر لی اور گر کر سسکنے لگا۔

ذیشان کے قتل کی خبر آناً فاناً پورے تیسفون میں پھیل گئی دونوں موبد اعظم اور شہزادہ خسرو بھی حاضر ہو گئے۔

ذیشان کی تجہیز و تکفین کے بعد شہزادہ گلنار کو محل میں لے گیا۔

اب آذر فرونگ میں خوش نواز کے لیے کیا رہ گیا تھا وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن شہزادے کے حکم کے بغیر کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا پھر یہ خبر سننے میں آئی کہ شہزادے نے باپ کو نظر بند کر کے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی ہے۔

شہزادے نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا اور اسے بتایا کہ وہ کیا ہوا وعدہ بھولا نہیں ہے جب بھی کہے اسے ہیربدوں کے طبقے میں داخل کرا دیا جائے گا۔

خوش نواز نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، "خوش بخت اور اقبال مند شہزادے! میں جس طبقے میں ہوں،

اسی میں رہنا چاہتا ہوں۔"
شہزادے نے کہا، "لیکن ہم تمہیں کچھ دینا چاہتے ہیں!"
خوش نواز نے جواب دیا، "ہزار مویشی فراہم کر دیے جائیں، بڑی بندہ پروری ہوگی کیونکہ اب یہ خادم معمار کا کام نہیں کرنا چاہتا گلہ بانی کرے گا۔"
شہزادے کے حکم سے خوش نواز کو ہزار مویشی عطا کر دیئے گئے جنہیں وہ لے کر سلوکیا چلا گیا۔

اس بات کو پندرہ سال گزر گئے اور اس عرصے میں شہزادہ خسرو نے نوشیرواں عادل کا خطاب حاصل کر لیا تھا مگر اسے نوشیروان دادگو بننے سے پہلے باپ کو قید، بھائیوں کو ہلاک اور بھتیجوں کو قتل کرا دینا پڑا تھا، مزدک اور مزدکی اس کے پہلے شکار تھے، ایک دن شکار کھیلتا ہوا وہ سلوکیا کے اس حصے میں نکل گیا جہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ ملتا تھا۔ تھک ہار کر وہ پانی کی تلاش میں ایک کٹیا کے دروازے تک پہنچا کٹیا کے برابر جانوروں کا ایک بہت بڑا باڑا تھا۔ کٹیا کے اندر سے ایک ادھیڑ عمر سنکی سا انسان نکلا وہ نوشیرواں کو دیکھتے ہی ادب سے جھک گیا۔ نوشیروان نے اس سے پانی مانگا۔ وہ شخص نوشیروان کو کٹیا کے اس دروازے پر لے گیا جو باڑے کی طرف کھلتا تھا وہاں ایک نہایت تنومند کتے کی لاش لٹک رہی تھی۔
نوشیران نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟ اسے کس ظلم کی تقصیر میں لٹکا رکھا ہے؟"
اس شخص نے جواب دیا، "جہاں پناہ! یہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوا تھا؟"
نوشیروان نے کہا، "ہم نوشیرواں دادگر ہیں، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو شاید ہم کوئی انصاف کر سکیں۔"
اس شخص نے کہا، "جہاں پناہ! میں نے اس ظالم کو ڈیڑھ ہزار مویشیوں کی گلہ بانی سونپی تھی، ادھر کچھ عرصے سے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میرے مویشی گھٹتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ جب گنے تو پتہ چلا پچاس جانور کم ہیں، میں پریشان بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی، میں اس جستجو میں لگ گیا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایک دن میں نے چھپ کر ایسا منظر دیکھا کہ میری عقل حیران رہ گئی۔" اس کے بعد اس نے کتے کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "جہاں پناہ! اس نے ایک بھیڑنی سے تعلقات استوار کر رکھے تھے اور اس کی محبت میں اندھا اور نافرض شناس ہو گیا تھا کہ اس سے اپنا کام نکالنے کے بعد، ایک آدھ مویشی اپنی خوشی سے اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ غلام کو جیسے ہی یہ حقیقت معلوم ہوئی، اس نے اسے سولی پر چڑھا دیا اور اس کی لاش عبرت کے لیے یہاں لٹکا دی۔"

نوشیراں نے افسوس کا اظہار کیا۔ "پھر بھی تم نے بڑا ظلم کیا؟"

اس شخص نے بے رخی اور بے مروتی سے جواب دیا۔ "لیکن قبلۂ عالم آپ کے غلام نے تو بس ایک ہی کتے کو ہلاک کیا ہے، اس نے مزدک اور اس کے بارہ ہزار ماننے والوں کو تو ہلاک نہیں کیا۔ اس ناچیز نے باپ کو قید، بھائیوں کو ہلاک اور بھتیجوں کو قتل تو نہیں کیا اور جہاں تک ناچیز کی رائے کا تعلق ہے میرا یہ قتل بیان کیے ہوئے سنگین جرموں سے تو ہلکا ہے!"

نوشیراں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "تم کہیں تم وہ معمار تو نہیں ہو؟"

معمار نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

نوشیراں نے اس کی تلخ نوائی اور حق گوئی کو برداشت کر لیا۔ لوگوں کی نظروں سے چھپتا چھپاتا یہ معمار شاہی لشکر میں پہنچا۔ ایک مدت کے بعد گلنار کی یاد نے پھر انگڑائی لی تھی، اس نے نوشیراں کی کنیزوں سے رشوت دے کر رابطہ قائم کیا اور ان سے گلنار کی بابت دریافت کیا تو ان میں جو سب سے زیادہ باخبر اور ہوشیار تھی اس نے جواب دیا۔ "یار تم کس گلنار کی بابت پوچھ رہے ہو۔ معلوم نہیں وہاں کتنی گلناریں پڑی ہیں!"

اس نے کہا۔ "وہ گلنار جو میر بد ذیشان کی بیٹی تھی!"

"وہ گلنار!" کنیز بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "وہ بڑھیا، اے بھائی یہ تم کتنی پرانی اور کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں نے تو اسے ایک مدت سے نہیں دیکھا۔ بھلا بادشاہ بھی کہیں زوال پسند ہوتے ہیں؟ کون جانتا ہے وہ کہاں ہے اور ہے بھی یا نہیں۔"

عجائب خانہ عشق

یہ اُس سنگتراش کی کہانی ہے جس کا نام پروسے تھا اور جس نے تقریباً دس سال بابل اور استخر میں سنگتراشی کرتے گزار دیئے تھے، اسے سنگتراشی کے علاوہ کانسی پر انسانوں اور جانوروں کی شبیہہ اتارنے کا فن بھی خوب آتا تھا اور اس میں اسے اتنا کمال اور مہارت حاصل تھی کہ دوسرے ہم پیشہ اس سے حسد کرنے لگے تھے، لوگ اسے رشک اور احترام کی ملی جلی نظر سے دیکھتے تھے۔

پروسے اس وقت پندرہ سال کا تھا جب اس کا باپ اسے لے کر یونان کے --- جنوب مشرق میں پھیلے ہوئے بے شمار جزائر کو پیچھے چھوڑتا ہوا ایشیائے کوچک کے ساحلی شہر میلاس میں داخل ہوا تھا۔ کچھ دنوں میلاس میں رہنے کے بعد پروسے کا باپ شام چلا گیا اور وہاں سے بابل کا رُخ کیا۔ بابل میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور اس نے یہاں کی عبادت گاہوں میں مقدس دیوی دیوتاؤں کے بہت سے بت تیار کئے۔ بتوں کے علاوہ اس نے پتھر کی چٹانوں میں

چھینی سمی اور ہتھوڑے کی مدد سے ایسی نادر تصویریں ابھرواں نقوش میں کھود دیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے اور اس کا دامن زر و جواہر سے بھر دیا۔ اس کی شہرت کو یہیں سے چار چاند لگے، اور قرب و جوار میں، دُور دُور تک اس کے بے مثل فن کا چرچا ہونے لگا۔ ایران کا شہنشاہ دارا سوم بھی استخر میں آئے دن اس کی تعریف سنتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس عجیب غریب سنگتراش کو دیکھنے اور اس سے کام لینے کا شوق پیدا ہوا اور اس نے بیس رُکنی وفد بھیج کر اسے استخر میں طلب کر لیا۔ جب یہ دونوں باپ بیٹے استخر پہنچے تو دارا نے ان کی بڑی عزت و تکریم کی اور نقش رستم نامی فن پاروں میں کچھ اور اضافہ کرا دیا۔ یہاں اس نے پانچ سال متواتر کام کیا اور دارائے سوم نے اس حد تک نوازا کہ وہ ایتھنز میں اپنے فن کی اتنی بڑی قیمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ابھی وہ شاید کچھ اور کماتا لیکن اس دوران اس کے پچیس سالہ نوجوان بیٹے پرومے سے ایک ایسی لغزش سرزد ہوگئی کہ پرومے کا باپ اگاتھان استخر کو فوراً چھوڑنے پر مجبور ہوگیا اور وہ پرومے کو لے کر ایتھنز واپس چلا گیا اگر اگاتھان ایسا نہ کرتا تو شاید وہ دونوں زندہ بھی نہ بچتے، پرومے کو شہنشاہ ایران دارائے سوم کے محل کی لڑکی سے بے پناہ عشق ہوگیا تھا اور یہ ایک ایسا خطرناک معاملہ تھا کہ اگر کسی طرح اس کی بھنک بھی شہنشاہ کے کان میں پڑ جاتی تو دونوں باپ بیٹے ہلاک کر دیئے جاتے، پرومے خود بھی اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اس کا یہ عشق کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن عشق میں حقائق بینی سے کام ہی کب لیا جاتا ہے، اگاتھان نے معاملے کی شدت سمجھ کر پرومے کو سمجھائے بغیر اسے ساتھ لیا اور شام ہوتا ہوا، روڈز پہنچا اور روڈز سے ایتھنز کے لئے روانہ ہوگیا، بدقسمتی سے ایتھنز پہنچنے کے پندرہ دن بعد اگاتھان کا انتقال ہوگیا اور پرومے تنہا اور اداس رہ گیا، اسے رہ رہ کر شرمینہ کی یاد ستاتی رہتی، وہ اپنے باپ کا فن اچھی طرح سیکھ چکا تھا اس نے کانسی کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر شرمینہ کی شبیہیں اُبھرواں اتاریں، خالی اوقات میں جب شرمینہ کی یاد بہت زیادہ ستاتی تو وہ کانسی کی شبیہہ سے پیار محبت کی باتیں اس طرح کرنے لگتا جیسے شرمینہ سچ مچ اس کے سامنے موجود ہو، اور پرومے اسے اپنے ہجر و فراق اور سوز و اضطراب کی دکھ بھری داستان سُنا رہا ہو، اس کا دل ایران جانے کے لئے بے چین رہتا لیکن جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی کیونکہ اس کی داستانِ عشق وہاں خاصا شہرہ پا چکی تھی اور بعض سیاحوں نے تو اسے یہاں تک خبردار کر دیا تھا کہ اگر وہ استخر واپس پہنچا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایران کا شہنشاہ اسے قتل کرا دے، ایتھنز واپس آنے کے بعد وہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو اس نے یونان کے شمالی حصوں کی سیاحت شروع کی، اس دوران اسے یہ کام کی بات معلوم ہوئی کہ مقدونیہ کا بادشاہ فلپ ایران پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے، اس نے سوچا کہ اس صورت میں فلپ کو کسی ایسے آدمی کی یقیناً ضرورت ہوگی جو ایران تک اس کی رہنمائی کر سکے، اس کے ذہن میں شرمینہ کے حصول کے لئے ایک منصوبہ ابھرا، یہی سوچ کر وہ ایتھنز سے پیلا کے لئے روانہ ہوگیا۔

دورانِ سفر راستے میں کسی ہم سفر نے اسے بتایا کہ پیلا میں میزا نامی جگہ پر یونان کا سب سے بڑا فلسفی اور عالم ارسطو لڑکوں کو درس دیتا ہے۔ اور وہیں پریوں کا وہ مندر بھی ہے جس کی دیواروں پر خوبصورت پریوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں تو فلپ سے ملنے سے پہلے اس نے پریوں کے مندر میں جانے کا منصوبہ بنایا۔

پریوں کے مندر کے سلسلے میں اس کے ذہن میں ایک اور منصوبہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر پریوں کی شبیہیں واقعی بہت اچھی نکلیں تو وہ ان کے مقابلے میں شہر بینہ کا مجسمہ ضرور تیار کرے گا اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرے گا کہ پریوں کا حسن ہم انسانوں میں بھی موجود ہے۔

اس کے آلات سنگتراشی لکڑی کے چھوٹے سے صندوق میں بند گھوڑے کی پشت پر رکھے ہوئے تھے اور گھوڑے کے ذرا آگے آگے اس کا ادھیڑ عمر رہنما اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار اونچے نیچے راستے طے کرتا ہوا میزا کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

اس طرح وہ دونوں پریوں والے مندر کے دروازے پر پہنچ گئے ان کے سامنے زیتون کے درختوں کے درمیان میزا کے مندر کی سرخ عمارت صاف نظر آ رہی تھی، ادھیڑ عمر رہنما نہایت پھرتی سے نیچے کود گیا۔

پروسے بھی گھوڑے سے نیچے آ گیا اور اپنے گھوڑے کو زیتون کے تنے سے باندھ دیا۔ وہ پیلا کے قدرتی مناظر کا عاشق ہو چکا تھا، یہ دونوں بے چینی سے مندر کے اس دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے، جن کی دیواروں پر پریوں کی ابھری تصویریں بنی ہوئی تھیں، ابھی وہ دروازے سے دور ہی تھے کہ ایک تنومند عظیم شحیم وحشی نے ان کا راستہ روک لیا اور کہنے لگا۔

"آج اولمپیاس تشریف لا رہی ہیں، وہ یہاں اپنے بیٹے سکندر سے ملاقات کر کے یہ دیکھیں گی کہ ان کے بیٹے کی تعلیم و تربیت استاد ارسطو کس طرح کر رہا ہے؟ جب تک ملکہ یہاں سے واپس نہیں جاتیں ہم کسی کو بھی درسگاہ کے اس احاطے میں داخل نہ ہونے دیں گے؟"

رہنما مجبور ہو گیا۔ اس نے پروسے کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ اجڈ وحشی بھی ٹھیک ہی کہتا ہے جب تک یہ سرکش اور مغرور عورت آکر واپس نہ چلی جائے ہم مندر میں داخل نہیں ہو سکیں گے!"

اس کے بعد وہ دونوں اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے درختوں پر گھنیرے پتوں کے درمیان چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ کچھ دور پانی کا حوض تھا۔ یہ دونوں حوض کی دیوار پر بیٹھ گئے اور وہیں پروسے کے رہنما نے اسے سکندر کی ماں اولمپیاس کی بابت کچھ خاص باتیں بتائیں، پروسے کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اولمپیاس نے خود ہی یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ سکندر فلپ کا بیٹا نہیں ہے بلکہ سکندر کا اصل باپ زیوس دیوتا (جیوپیٹر) ہے جو اولمپس پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر رہتا ہے، اس انکشاف کے بعد رہنما ہنسا اور کہنے لگا "لیکن اس کی اس بات پر کوئی کس طرح یقین کر سکتا ہے، اور پیلا کے اکثر لوگ سکندر کو اولمپیاس کی جائز اولاد نہیں سمجھتے، خود فلپ بھی اس سے برگشتہ اور دل برداشتہ ہو گیا ہے" پھر رازداری سے بولا "لیکن کہیں تم اس کا چرچا نہ کر دینا کیونکہ اولمپیاس بڑی سرکش اور مغرور عورت ہے، غصے میں آکر کچھ بھی کر گزر سکتی ہے!"

پروسے کو رہنما کی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اس نے یہ ضرور سوچا کہ وہ فلپ جو پورے یونان کو متحد کر کے ایران پر حملہ آور ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے اپنے گھر کے انتشار پر قابو پانے میں ناکام ہے، اسی لمحے پیچھے سے کسی شخص کی بلند آواز میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی، اس کے انداز میں بڑا تاثر اور یقین تھا، کوئی کہہ رہا تھا "یہ فلاسفی کیا ہے؟ ذرا اس مرکب لفظ کے ٹکڑے تو کرنا۔ فیلا + سوفی = فیلاسوفی فیلا کے معنی ہیں، میں محبت کرتا ہوں، اور سوفی کہتے ہیں عقل کو،

چنانچہ پورا جملہ بنا "میں عقل سے محبت کرتا ہوں" اور جو شخص بھی عقل کے خلاف کچھ کہتا ہے اس کی بات میں کتنا ہی زور ہو۔ اثر کیوں نہ ہو وہ فلسفی نہیں ہو سکتا۔"

دونوں نے گھوم کر پیچھے دیکھا، ایک بوڑھا اپنے نوجوان ساتھی کو ٹہل ٹہل کر عقل کی باتیں سکھا رہا تھا۔
رہنما نے پرڈمے کے کان کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی میں کہا "دوست! یہ بوڑھا شخص عظیم فلسفی اور دانا ارسطو ہے اور یہ خوبصورت نوجوان جو عقل کی باتیں سیکھ رہا ہے سکندر ہے۔ اب ہمیں ان دونوں سے لاتعلق بن کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔"
ارسطو کی تیز نظریں ان اجنبیوں کے چہروں میں پیوست ہو گئیں، دونوں فرطِ عقیدت و احترام سے قدرے جھک گئے! ارسطو نے قریب پہنچ کر خوش اخلاقی سے دریافت کیا "دوستو! تم یہاں کس کے پاس آئے ہو؟"
رہنما نے جلدی جلدی جواب دیا "اے علم و دانش کے پیکر! میں اپنے ساتھی کا رہنما ہوں، اور یہ شخص پرڈمے حقیقتاً ایتھنز کا بہنے والا مشہور سنگتراش ہے، جو مشرق کی سرزمینوں میں کافی وقت گزار کر یہاں آیا ہے اور یونان کی سیاحت کرتا پھر رہا ہے اس وقت پریوں کے مندر کی شبیہیں دیکھنے آیا تھا لیکن افسوس کہ معلوم ہوا اس وقت ملکۂ عالیہ بھی یہاں تشریف لانے والی ہیں اور جب تک وہ آ کر واپس نہ چلی جائیں ہمیں مندر میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی چنانچہ ہم دونوں یہاں اس حوض کی دیواروں پر بیٹھ کر ملکہ کی تشریف آوری اور واپسی کے منتظر ہیں۔"
رہنما نے محسوس کیا کہ نوجوان سکندر کی پرشوق نظریں پرڈمے کے چہرے پر گڑ کر رہ گئیں ہیں۔
ارسطو کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں "کیا تم فیاڈیاس جیسا کوئی شاہکار بے جان پتھر تراش کر تیار کر سکتے ہو جس نے ایتھنز میں ایکرو پولیس کی پہاڑی پر ایتھینا دیوی کا عظیم الشان بت تراش کر کھڑا کر دیا۔"
پرڈمے نے جواب دیا "بزرگ ارسطو! میرے یہاں آنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ میں پریوں کے مندر میں باکمال سنگتراشوں کی تراشی ہوئی خوبصورت پریوں کی شبیہیں دیکھوں اور اس کے بعد ایک ایسا شاہکار تیار کروں جو فیاڈیاس کی طرح رہتی دنیا تک یادگار رہے۔"
ارسطو مسکرایا "لیکن ایک بات کا خیال رکھنا، اس دنیا میں اگر کہیں پریاں ہیں اور وہ صورت شکل میں اس مندر کی دیواروں ہی جیسی ہیں تو ہم انسانوں کو ان کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیئے، یہ تو بہت ہی بھونڈی ہیں ہم انسان تو ان سے کہیں زیادہ اچھے اور خوبصورت ہوتے ہیں" پھر ہنس کر دریافت کیا "کیا تم لطیف اور اعلیٰ جمالیاتی مذاق رکھتے ہو؟ یا تم بھی بے سروپا ٹیڑھے میڑھے اٹھے ترچھے خدوخال تراش کر ہنسنے ہنسانے کا سامان کر جاؤ گے؟"
پرڈمے نے جواب دیا "بزرگ استاد! میرے ذہن میں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کا تصور پہلے ہی سے موجود ہے، میں اس کو پتھر میں منتقل کرنے کے لئے مضطرب ہوں۔"
ارسطو نے ان دونوں کو حکم دیا "تم دونوں میرے پیچھے پیچھے مندر میں آ جاؤ، شاید سکندر کی ماں ملکہ اولمپیاس کی سواری آنے ہی والی ہے!"

یہ دونوں بھی ارسطو اور سکندر کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے مندر میں داخل ہو گئے اس بار وحشی دربان نے ان کا راستہ نہیں روکا،
اندر داخل ہوتے ہی پردے کو اپنے دائیں بائیں دیواروں پر پریوں کی منقش تصویریں دکھائی دیں۔ ان کے بارے میں ایک حسین تصور رکھتا
تھا مگر انہیں دیکھ کر بہت مایوس ہوا۔

تھوڑی دیر بعد مندر کے دروازے پر دو رتھ رکے ایک رتھ میں چار گھوڑے جتے تھے، دوسرے میں دو۔ چار گھوڑوں والے
رتھ پر سے ریشمی لباس میں ملبوس اولمپیاس اس شان سے اتری کہ اس کے آس پاس دو نہایت حسین کنیزیں اسے اترنے میں سہارا دے
رہی تھیں، دوسرے رتھ سے چار خدمت گار اتر کر اولمپیاس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، جب وہ اندر داخل ہوئی تو دروازے کے قریب
ہی استقبال کرنے والوں میں ارسطو اور سکندر پیش پیش تھے۔ اولمپیاس ایک لمحے کے لئے رکی اور ارسطو کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا
اور کنیزوں کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اولمپیاس دیر تک اس درسگاہ کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتی رہی اور اس بات کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئی
کہ اس کے بیٹے سکندر کا استاد ارسطو صرف نظری ہی نہیں، عملی تعلیم بھی دیتا ہے۔ کیونکہ یہاں ایک گوشے میں طرح طرح کے نقشے
اور مختلف دھاتوں کی ناقابل فہم چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

دفعتاً اولمپیاس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے ارسطو سے پوچھا "دانشمند ارسطو! کیا تم سکندر کے مستقبل سے مطمئن ہو؟"
ارسطو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "عام طور پر اہلِ یونان متعدد تیر والوں کو طنزاً قنطورس کہتے ہیں، یعنی ایک ایسی مخلوق
جس کا نصف جسم آدمی کا ہو اور نصف گھوڑے کا۔ میرا خیال ہے سکندر واقعی قنطورس ہے کیونکہ اس میں آدمی کی عقل، بات سمجھنے کا
شوق اور جستجو اور گھوڑے جیسی سرکشی، تمردی، ہٹ دھرمی اور کبھی نہ تھکنے والا حوصلہ بیک وقت موجود ہیں اور جس میں یہ خوبیاں موجود ہوں
اس کا مستقبل تاریک نہیں ہو سکتا۔"

اولمپیاس کے مغرور چہرے پر مسکراہٹ کی شادابی پھیل گئی جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ ارسطو کے پاس سکندر کا وقت ضائع نہیں
ہو رہا ہے۔ اس نے ارسطو کے دوسرے شاگردوں کو سرسری نظر سے دیکھا اور کہنے لگی "لیکن تمہیں یہ ضرور ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ سکندر
کو اس درسگاہ کے دوسرے شاگردوں سے مختلف ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ اس کا باپ کبھی کبھی کہنے لگتا ہے کہ سکندر تو کتابوں کا
کیڑا بنتا جا رہا ہے اور اس کی تعلیم و تدریس پر جو رقم خرچ ہو رہی ہے، وہ ضائع جا رہی ہے لیکن خود میری رائے اس سے مختلف
ہے اور میں تم سے اور سکندر کے مستقبل سے پوری طرح مطمئن ہوں۔"

اسی دوران اولمپیاس نے کنکھیوں سے دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ درسگاہ کا ایک نوجوان اس کی کنیز ہلینا کو بڑے انہماک سے دیکھ
رہا ہے، اولمپیاس کو نوجوان کی اس جرأت میں گستاخی کی بو محسوس ہوئی۔ اس نے ارسطو سے تنکا پیتا کہا۔
"جب کسی نوجوان میں مخالف جنس کے لئے شدت کی ہوس پیدا ہو جائے تو تم جیسے لائق اور دانا و بینا استاد کو چاہیئے کہ وہ پہلے
اس کے مرضِ ہوس کا علاج کرے اس کے بعد تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کرے۔"
ارسطو نے چونک کر اپنے آس پاس کا جائزہ لیا، سارہ اوج پرمے اب بھی اولمپیاس کی کنیز ہلینا کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ پروے

کی نظریں بھی بے خیالی میں ارسطو کی طرف مڑ گئیں، وہ زیر لب اپنے آپ سے کہنے لگا "خوب! بالکل ویسی ہی ہو بہو، ذرا بھی تو فرق نہیں، صرف لباس کا فرق ہے، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

ارسطو نے اولمپیاس کو جواب دیا "معزز خاتون! جس نوجوان کی طرف آپ کا روئے سخن ہے وہ میری درسگاہ کا طالب علم نہیں ہے یہ تو ایتھنز کے مشہور سنگتراش اگاتھان کا بیٹا پردمے ہے اور خود بھی بڑا سنگتراش ہونے کا دعویدار ہے۔"

اولمپیاس نے کہا "پردمے کا باپ اگاتھان غیر معمولی شہرت رکھتا تھا اور ہم اس کا غائبانہ ذکر بار ہا سنتے رہے ہیں یقیناً اس کا بیٹا بھی بڑا سنگتراش ہوگا۔"

اولمپیاس نے پردمے کو سرسری مگر گہری نظروں سے دیکھا اور سکندر کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں کچھ کہا، جب واپس آئی تو سکندر کی زبانی پردمے کو اولمپیاس کا یہ حکم ملا کہ وہ واپس نہیں جا سکتا اسے آج ہی اسی وقت خدمت گاروں کے رتھ میں بیٹھ کر شاہی محل جانا ہے۔

یہ کیا اور کیونکر ہوا؟ پردمے کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا لیکن وہ اس حکم سے دہشت زدہ ضرور ہو گیا۔ اس نے گڑگڑاتے ہوئے عرض کیا "لیکن ملکہ عالیہ! مجھے اتنی مہلت ضرور دیجئے کہ میں اپنی محبوبہ ثمرینہ کا ایک شاندار اور حسین مجسمہ تیار کر لوں!"

اولمپیاس نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں رعونت سے گردن کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر ایک طرف خم کیا اور چند لفظوں میں اپنا اٹل فیصلہ دہرا دیا "کچھ نہیں، صرف تعمیل، ہم عذر سننے کے عادی نہیں ہیں۔"

پردمے نے مدافعت کا ایک تیر اور چلایا "ملکہ عالیہ! میں بابل اور ایران میں دس سال رہا ہوں اور وہاں کے لوگوں اور راستوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوں اور اب جبکہ مقدونیہ کا بادشاہ اور ملکہ کا شوہر ایران پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے تو میں ان کے لئے بہترین رہبر ثابت ہو سکتا ہوں۔"

لیکن اولمپیاس کے پاس سنگتراش سے بات کرنے کے لئے زیادہ الفاظ نہیں تھے اس نے اپنی فطری رعونت کی بنا پر کم سے کم لفظوں میں جواب دیا "کچھ نہیں صرف تعمیل" پھر وحشی دربان کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے پردمے کو جکڑ کر کھینچتا ہوا مندر کے باہر نکل گیا۔ پردمے نے بہتیرے ہاتھ پیر چلائے، مچلا، پھسلا اور وحشی کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن مندر سے باہر نکلتے ہی اولمپیاس کے دوسرے آدمیوں نے بھی اسے گھیر لیا۔ اس نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اسے زبردستی لے جا کر رتھ میں بٹھا دیا گیا۔ جب اس نے یہ سمجھ لیا کہ اب اس کا پیچھا نہیں چھوٹ سکتا تو اسے اپنے آلات سنگتراشی کے صندوقچے کی یاد آئی، اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا "اچھا تم لوگ مجھے جہاں بھی لے چلو گے چلوں گا لیکن میرے آلات سنگتراشی کا صندوقچہ تو منگوا لو۔"

مندر کے دروازے میں سے اولمپیاس اپنی دونوں کنیزوں کے ساتھ نمودار ہوئی، اس کے پیچھے ارسطو اور سکندر تھے، ان دونوں کے پیچھے درسگاہ کے دوسرے شاگرد اور پردمے کا حیران و پریشان رہنما تھا۔

اولمپیاس کے حکم پر رہنما مردوں کی طرح آلات کا صندوقچہ اٹھا لایا اور خود ہی پردمے کے حوالے کر دیا۔ اس دوران

اولمپیاس اپنی دونوں کنیزوں کے ساتھ چار گھوڑوں کے رتھ میں بیٹھ کر کوچ وان کو روانگی کا اشارہ کر چکی تھی، جیسے ہی ملکہ کا رتھ چلا، پرسے والا رتھ بھی چل پڑا۔

یوں تو بد دماغ اولمپیاس پرسے سے بہت برہم تھی لیکن وہ اپنے محل کے خدام کے نجی معاملات میں بڑی دلچسپی لیتی تھی، وہ عجیب قسم کی عورت تھی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی کنیز ہلینا میں پرسے کی ایرانی محبوبہ شیرینہ کی حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے اور اس مشابہت نے پرسے سے اس کے ہوش و حواس چھین لئے تھے تو وہ بہت ہنسی لیکن اس کے ساتھ ہی ہلینا پر پابندی لگا دی کہ وہ اس سنگتراش سے دُور دُور رہے، پرسے کئی دن تک پریشان رہا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نامعلوم غلطی کے جرم میں اگر اسے قتل نہ کیا گیا تو کوئی سخت سزا ضرور دی جائے گی، لیکن جب اولمپیاس نے اس کے جرم کا انکشاف کیا اور اس کا جواب طلب کیا تو اس نے اصل حقیقت صاف صاف بیان کر دی۔

اولمپیاس اس کے سامنے تو کچھ نہ بولی لیکن اس نے اپنی کنیزوں کے سامنے ہنس ہنس کر پرسے کی بے بسی کا حال بیان کیا، پرسے شاہی محل کے ایک حصے میں پڑا ہوا قید یا رہائی کے پروانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہلینا اس کے سینے کی خفتہ آگ روشن کر کے محلسرا میں کہیں روپوش ہو چکی تھی، اور اس بڑے محل میں دوبارہ ملاقات یا دیدار کا کوئی امکان نہیں تھا، اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر اولمپیاس نے اسے کسی قسم کی سزا بھی دے دی تو وہ ایک بار ملکہ سے یہ درخواست ضرور کرے گا کہ وہ شیرینہ کا ایک حسین ترین مجسمہ تراشنا چاہتا ہے اور چونکہ یہ مجسمہ محض تصور کی مدد سے تیار نہیں ہو سکتا اس لئے ہلینا کو کچھ مدت کے لئے اس کے روبرو رہنے کا حکم دیا جائے۔ وہ اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے یا بٹھا کر شیرینہ کا مجسمہ تیار کرنا چاہتا ہے، مجسمے کی تیاری کے بعد اگر ملکہ چاہے تو اسے قتل بھی کرا سکتی ہے، پرسے اس کے بعد بھیانک سزائے موت بھی بخوشی قبول کرے گا، لیکن اولمپیاس تو محل کے ایک گوشے میں اسے مقید کر کے غالباً بھول چکی تھی، یوں بھی وہ ایک مردم آزار ملکہ کی حیثیت سے مشہور تھی، بس مقررہ وقت پر خدمت گار آتے اور اپنی خدمتیں انجام دے کر چلے جاتے، کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ ان خدمتگاروں کے ذریعے ملکہ کو کوئی پیغام بھیج دے لیکن مزاجِ شاہی کے برہم ہونے کے وسوسوں نے اس کی زبان کو تالا لگا دیا تھا لیکن ان خطرناک لمحات میں امید کی دیوی مسکرا کر سامنے آ جاتی اور کہتی "پرسے! کچھ اور انتظار کر شاید روشن لمحات آ جائیں"۔ اس زنداں میں اس نے ہلینا کے متعلق اتنا سوچا کہ وہ اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے بڑی مہم سر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

اسی آسرے میں دو ہفتے نکل گئے اور وہ تقریباً مایوس ہو گیا لیکن ایک دن رات کو جب وہ سو جانے کی کوشش کر رہا تھا اور محلسرا کے کسی گوشے سے ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں اس کے دل میں ہیجانی کیفیت پیدا کر رہی تھیں، ایک بربری خدمتگار نے اسے مطلع کیا کہ اسے ملکہ نے یاد کیا ہے۔ اور اسے اسی وقت اس کی بارگاہ میں پہنچنا ہے، وہ پھرتی سے اٹھا اور لباس درست کر کے خدمت گار کے ساتھ ہو لیا۔ محلسرا کی کھڑکیوں کے مختلف رنگوں کے شیشوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی اور رات میں کھلنے والے پھولوں کی تیز اور بھینی بھینی خوشبو نے ماحول کو حد درجے رومانی بنا دیا تھا، محل کے بے شمار دالانوں اور غلام گردشوں سے گزرنے کا اس کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا، اسے اس قصر میں ایران کے دارالحکومت استخر کے محلات یاد آ گئے

یاد آئے۔ وہ محلات جن کے کسی حصے میں اس کی محبوبہ شربینہ رہ رہی تھی اور جہاں وہ پہلی بار عشق کی لذت سے آشنا ہوا تھا، شربینہ کے فوراً بعد ہلینا یاد آنے لگی، وہ ہلینا جو اسی محل کے کسی کمرے میں پردے سے بے نیاز محو خواب ہو گی یا اولمپیاس کی مصاحبت میں اپنی خدمات یا دلچسپ باتوں سے اسے لطف اندوز کر رہی ہو گی۔ اسی لمحے دل میں اس تمنا نے انگڑائی لی کہ کاش اولمپیاس کی خدمت میں وہ اس وقت بھی موجود ہو۔

اولمپیاس کی خواب گاہ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ایک طلسماتی کیف آور دنیا ہر شے کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اولمپیاس مہین زیر جامے میں لپٹی ہوئی دو موروں والی مسہری پر دراز تھی، اس نے اپنے سینے پر ایک ریشمی ٹکڑا ڈال کے اپنے نشیب و فراز کو چھپا لیا تھا۔ بربری خدمتگار اسے اندر چھوڑ کر چلا گیا۔ خوفزدہ اور لرزہ براندام پرڈسے نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا، ملکہ اولمپیاس نے نہایت بے تکلفی سے اس ڈرے سہمے سنگتراش کے سراپا کا جائزہ لیا اور نہایت خشک لہجے میں مخاطب کیا: "ہم اس وقت اداس تھے۔ اس لئے تجھے بلا لیا۔ بتاؤ تم ایک مجسمہ کتنے دنوں میں تیار کر لیتے ہو؟"

پرڈسے کی جان میں جان آئی، کہنے لگا: "یہ شخصیت کی نوعیت پر موقوف ہے اگر اس کا چہرہ لباس اور بعض دوسری چیزیں سیدھی سادی سپاٹ ہوں گی تو اس کا مجسمہ جلد تیار ہو جائے گا لیکن اگر وہ عمر رسیدہ، جھریوں دار اور پیچیدہ لباس میں ہو گا تو اس کے مجسمے کی تیاری میں کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا۔"

اولمپیاس نے بے تعلقی اور بے نیازی سے کہا: "ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ تم شاہی آداب سے کس قدر واقف ہو، کیا تم بہت زیادہ باتیں کرتے ہو؟"

پرڈسے نے خوفزدگی سے جواب دیا: "ویسے تو یہ خادم کتنی ہی ہرزہ سرائی یا بکواس کیوں نہ کرے لیکن جب آپ کی ذات درمیان میں آ جائے گی تو یہ ناچیز ملکہ کی مرضی اور ایماء کے بغیر کوئی قدم اٹھانا گناہِ عظیم تصور کرے گا۔"

اولمپیاس نے دوسرا سوال کیا: "کیا تمہیں سپاہ گری بھی آتی ہے؟"

"خوب اچھی طرح" پرڈسے نے جواب دیا: "میں اب تک کئی ایرانیوں کو قتل کر چکا ہوں۔ اور اگر میں سنگتراش نہ ہوتا تو ایک جانباز اور دلیر سپاہی ضرور ہوتا۔ مجھے مشکل مہمیں سر کرنے میں لطف آتا ہے۔"

"لیکن جب تم ہمیں میزا کے پریوں والے مندر میں ملے تھے تو تم وہاں نہتے تھے، پھر ہم کس طرح سمجھیں کہ تمہیں ہتھیار چلانے کا بڑا شوق ہے۔ بغیر ہتھیار کے مرد ہمیں سخت ناپسند ہیں۔"

پرڈسے کچھ نادم ہو گیا، بولا: "جب سے اس ناچیز نے سنگتراشی کا کام شروع کیا ہے ہتھیاروں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، یہ تعمیر کا قائل ہے۔ تخریب کا ہرگز نہیں۔"

اولمپیاس مسکرانے لگی: "لیکن سادہ لوح نوجوان! کیا تو نے اس پر ذرا بھی غور نہیں کیا کہ جس تعمیر کا تو ذکر رہا ہے اس میں پہلے تجھ کو زخمی کیا جاتا ہے پھر اس تخریب کے پردے میں تعمیر کا کام ہوتا ہے۔"

پرڈسے اس چالاک عورت کی منطق اور دلیل میں اس طرح پھنس گیا، جیسے کسی مکڑے کے جال میں کوئی مکھی، وہ لاجواب

ہو کر چپ ہو گیا۔

اسی لمحے ملکہ اولمپیاس کے سرہانے کا دروازہ کھول کر حسین ہلینا اندر داخل ہوئی اور اس وقت وہ جس لباس یا جس وضع قطع میں تھی اس نے پروٹے کو ہلا کر رکھ دیا وہ اس دوشیزہ کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا لیکن خطرناک اور عیب جو اولمپیاس کی موجودگی میں ایسا تقریباً ناممکن تھا۔ اس نے پہلی نظر میں اچانک ہلینا کو جتنا دیکھ لیا تھا اسے اسی پر اکتفا کرنا پڑا بلعد میں کنکھیوں تک سے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ غالباً اولمپیاس وہ طوفان محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اولمپیاس کو شرارت سوجھی، اس نے ہلینا کو اشارہ کیا کہ وہ میز پر رکھی ہوئی شراب کا ایک پیالہ بھر کر اپنے ہاتھ سے پروٹے کو پیش کرے۔

ہلینا آگے بڑھی، نہایت اطمینان سے پیالے میں شراب انڈیلی اور پیالہ ادب سے لے جا کر پریشان پروٹے کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں شوخی کھیل رہی تھی، اولمپیاس کی خواہش پر وہ پروٹے کے سامنے کچھ اس طرح دوزانو ہو گئی کہ ہلینا کا چہرہ پروٹے کی زنتن میں گڑی ہوئی نظروں کے سامنے آگیا۔ اس نے اس غارت گر ہوش دحواس کو گہری نظروں سے دیکھا اور شراب کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پیالہ لے لئے جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح دوزانو رہی اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتی رہی؛

پروٹے نے شراب کا پیالہ تھوک دان میں الٹ کر شراب گرا دی اور واپس اپنی جگہ آکر کھڑا ہو گیا۔

اولمپیاس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "سخت گستاخی!" وہ گرجی "سنگی ہمارے عطیے کو پھینکتا ہے!"

پروٹے نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "یہ ناچیز سنگتراش ملکۂ عالیہ کی ہر سزا جھیلنے کو تیار ہے۔ لیکن اگر اجازت مرحمت ہو تو شراب پھینکنے کے جواز سے ملکۂ عالیہ کو بھی مطلع کروں"

ملکہ نے اثبات میں گردن ہلا دی گویا کہہ رہی ہو "صاف صاف عرض کرو، اجازت ہے"

پروٹے کہنے لگا "ملکۂ عالیہ! مجھے اس وقت شراب کی نہ تو خواہش تھی اور نہ ہی یہ جگہ ایسی ہے جہاں شراب نوشی جیسا گستاخانہ فعل عمل میں لایا جائے، شراب کے نشے کے بعد ہلینا کی موجودگی میں یقیناً اس بات کا خدشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں یہ خادم بدمستی میں ہاتھ نہ اٹھا دے۔ اگر اس ناچیز کو ملکۂ عالیہ کی حرمت اور تکریم کا خیال نہ ہوتا تو ضرور اس مے نشاط انگیز سے لطف اندوز ہوتا"

ملکہ اولمپیاس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا جب اس نے اچھی طرح یہ محسوس کر لیا کہ اولمپیاس کے مزاج میں خوشگواری آگئی ہے تو اس نے مزید عرض کیا "جیسا کہ ملکۂ عالیہ خود بھی آگاہ ہیں یہ ناچیز فنون لطیفہ کے شعبۂ سنگتراشی سے تعلق رکھتا ہے ہم لوگ بہت حساس اور لطیف خیالات کے حامل ہوتے ہیں، میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جو نشہ کسی کی مست اور نشیلی آنکھوں سے بڑھا ہوا اس کا مزہ شراب پی کر کرکرا کر دیا جائے"

اولمپیاس نے آہستہ آہستہ کہا "تم بہت چرب زبان ہو"

پروٹے چپ ہو گیا۔ ملکہ نے ہلینا کو اشارے سے حکم دیا کہ وہ پروٹے کے پاس سے ہٹ کر اس کے قریب آجائے اور اس

کے ہٹتے ہی پرڈیمے نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کا چین سکھ چھن گیا ہو۔

ملکہ نے کہا "تم نے سکندر کو ضرور دیکھا ہوگا۔ وہی جو اس روز طنا ارسطو کے حلقۂ درس میں سب سے آگے اور اپنے استاد سے بہت زیادہ قریب تھا، وہ ہمارا بیٹا اور مقدونیہ کا ولی عہد ہے، وہ فلپ کا نہیں زیوس دیوتا (جیوپیٹر) کا بیٹا ہے، کیا تم نے پریوں کے مندر کے دروازے پر کندہ یہ عبارت نہیں پڑھی تھی کتاب میں لافانی ہوں۔ مجھے موت کا ہاتھ نہیں چھو سکتا، ہم چاہتے ہیں کہ تم اس کا ایک شاندار سنگی مجسمہ تیار کرو اور اس مجسمے میں نوجوان سکندر کی نوجوانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید کردو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم یہ کام بہت اچھی طرح کر سکتے ہو، تم اگاتھان کے بیٹے ہو اور اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہو۔"

پرڈیمے کی ذہین اور موقع شناس طبیعت اس وقت اور اس لمحے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا چکی تھی، اس نے تامل کئے بغیر اپنی درخواست پیش کردی "ملکۂ عالیہ!" اس کی زبان لڑکھڑا گئی "یہ ناچیز بے شک لافانی سکندر کا ایک ایسا مجسمہ تیار کرسکتا ہے جس کی نوجوانی پر ماضی حال یا مستقبل کا کوئی اثر نہ ہوگا وہ ہمیشہ نوجوان رہے گا لیکن خاکسار اس سے پہلے مشق کے لئے ایک دوسرا مجسمہ تراشنے کا خواہش مند ہے، اس کے لئے جب تک ملکۂ عالیہ اجازت مرحمت نہ فرمائیں گی یہ خادم اس کی جرأت تک نہ کرسکے گا، خادم کو مجسمہ سازی چھوڑے ہوئے کئی ماہ گزر گئے ہیں۔"

ملکہ کی ذہانت فوراً تاڑ گئی کہ یہ نوجوان سنگتراش کیا کہنے والا ہے، اس نے کہا "خوب، ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت تم کونسی درخواست پیش کرنے والے ہو۔" پھر ہلینا کو مخاطب کرتی ہوئی بولی "ہلینا! چند دنوں کے لئے تمہیں اس نوجوان سنگتراش کی صحبت میں رہنا ہوگا، یہ تمہارا ایک مجسمہ تیار کرنے کا خواہشمند ہے۔" پھر پرڈیمے سے درشت لہجے میں مخاطب ہوئی "اور تم نوجوان سنگتراش! سن لو اس کا خوب اچھی طرح خیال رکھو گے کہ یہ بات مجسمے کے معاملے سے آگے ہرگز نہ بڑھے ہم تم دونوں کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سننا قطعی پسند نہ کریں گے۔" وہ پھر ہلینا سے مخاطب ہوئی "تمہیں معلوم ہے کہ تو اس تباہ حال اور درماندۂ عشق سنگتراش سے محبت نہیں کرتی، اس لئے مجسمہ سازی کے دوران جب بھی یہ بہکے تو درشت مزاجی سے اس کے عشق کی گرد جھاڑ دینا۔" ہلینا نے گردن جھکالی۔

ملکہ نے پرڈیمے کو حکم دیا "اب تم جا سکتے ہو لیکن جانے سے پہلے یہ ضرور بتاتے جاؤ کہ تمہیں ہلینا کے مجسمے کی تیاری میں کتنا وقت لگ جائے گا اور اس کے بعد ہمارے سکندر کا مجسمہ کب تیار کرو گے اور اس میں کتنے دن صرف ہوں گے۔"

پرڈیمے نے دل ہی دل میں دنوں کا تخمینہ لگایا اور اولمپیاس کو مطلع کیا کہ تقریباً ایک ماہ تو ہلینا کے مجسمے کی تیاری میں صرف ہوگا اور اس سے کچھ زیادہ وقت سکندر کی مجسمہ سازی میں لگے گا۔

اولمپیاس نے پرڈیمے کے جاتے جاتے اسے متنبہ کیا: "دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کے معاملات میں ہمیں مداخلت کرنی پڑے۔ ہمیں یہ بات بالکل پسند نہیں ہے کہ ہماری حسین کنیز جو سکندر کی آسودگی کے لئے وقف ہے ایک سنگتراش کی محبوبہ کہلائے تم کوشش یہی کرنا کہ ہلینا کو سامنے بٹھا کر اپنی ایرانی محبوبہ کا مجسمہ تیار کردو، مجسمے کی تیاری پر ہم اس کا غور سے معائنہ

کریں گے۔ اس میں سرتا پا ہلینا ہی کا حسن اور پیکر موجود ملا تو تمہیں اپنی اس جرأت کی سزا بھگتنی پڑے گی"۔ اس کے بعد پرڈمے وہاں سے چلا گیا۔

اولمپیاس نے ہلینا کو ایک بار پھر سمجھایا "بے وقوف لڑکی! ہم جانتے ہیں کہ تو کتنی حسین ہے۔ اس محل میں تیری بہبود کا ایک موقع نکلنے والا ہے اگر تو نے احتیاط اور ضبط سے کام لیا تو تجھے ایک ایسی ذات کا قرب حاصل ہوگا جس پر تو فخر کرے گی"۔

ہلینا خاموش رہی اور بد مزاج ملکہ اولمپیاس اسے بار بار تنبیہہ کرتی رہی کہ مجسمہ سازی کے دوران پرڈمے سے اس کے کسی قرب کا پتہ چلا تو عتاب نازل ہوگا۔

پرڈمے کو محل سے باغ کا وہ حصہ صاف نظر آتا تھا، جہاں بادشاہ فلپ، سکندر یا شاہی خاندان کا کوئی دوسرا فرد دو شیروں والی بنچ پر بیٹھ کر غور و فکر کیا کرتا تھا۔ ہلینا نے اسے یہ بات بھی بتائی کہ ملکہ اب یہ چاہتی ہے کہ محل کی بعض خوبصورت کنیزیں اپنے ہتھکنڈوں سے نوجوان سکندر کا دل موہ لینے کی کوشش کریں اور جب سکندر ان میں سے کسی ایک پر راغب ہو جائے تو وہ کنیز سکندر کی جنسی تشنگی کو شوق، رغبت اور پورے جوش اور سرگرمی سے بجھاتی رہے، کیونکہ اولمپیاس کے بقول اب اس کا بیٹا سکندر جوان ہو چکا ہے اور وہ عورت کی ضرورت بھی ضرور محسوس کرتا ہوگا۔

ہلینا کو اس وقت بڑی مشکل پیش آئی جب پرڈمے نے اس سے یہ خواہش کی کہ وہ ریشم کا دبیز لباس اتار کر مہین پیرجامے میں کھڑی ہو جائے، ہلینا نے ترش لہجے میں کہا "ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟"

پرڈمے نے جواب دیا "نازک اندام ہلینا! میں کیا کروں، میں مجبور ہوں، موٹے لباس کی وجہ تمہارے جسم کے صحیح خدوخال مجسمے میں نہیں آسکیں گے، میں چاہتا ہوں تمہارے مجسمے میں تمہارے جسم کا ایک ایک عضو نمایاں طور پر نظر آئے۔ میں تمہارے بازوؤں اور پنڈلیوں کی مچھلیاں تک اپنے مجسمے میں منتقل کر دینا چاہتا ہوں۔ یقین کرو کہ یہ ایک شاندار اور شاہکار مجسمہ ہوگا"۔

ہلینا نے کہا "جب تک میں ملکہ سے اس کی اجازت نہ حاصل کر لوں، ایسا نہیں کر سکتی"۔

دوسرے دن ملکہ نے باریک زیر جامہ پہن کر بیٹھنے کی اجازت دے دی اور وہ تقریباً نیم عریاں ہو کر پرڈمے کے روبرو بیٹھ گئی۔

پرڈمے کے جی میں کئی بار آئی کہ ہلینا سے اپنے شوق کی بے تابی کا اظہار کرے لیکن محل کے در و دیوار مشکوک ہوتے ہیں، اسے کوئی اعتبار نہ تھا اُس کا خیال تھا کہ ہلینا سے اگر کچھ ایسی ویسی باتیں کی گئیں تو یہ خود اندر جا کر اولمپیاس سے کہہ دے گی۔

جب وہ نیم عریاں لباس میں اس کے روبرو بیٹھتی تو اس کا اندازہ ہی کچھ اور ہوتا۔ اس کا ایک ہاتھ کمر پہ رکھا

ہوتا، دوسرے ہاتھ میں زیتون کی شاخ ہوتی اور بدن کا ایک ایک نقش نظروں کے سامنے ہوتا۔ جب نوبت اس کے سینے تک پہنچی تو وہ کچھ شرمانے لگی لیکن نوجوان سنگتراش نے یہ کہہ کر اس کی ہمت بندھائی کہ یہی تو وہ مقدس جگہ ہے جس کے پیچھے دل جیسی قیمتی چیز محفوظ ہے۔

پھر ہلینا نے یہ محسوس کیا کہ نوجوان سنگتراش بڑی دیر تک اس کے سینے پر نظریں جمائے دیکھتا رہتا ہے۔ اس نے شرما کر دریافت کیا۔

"اس طرح تم اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو، مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی تمہاری شکایت ملکہ تک نہ پہنچا دے۔"

پرڈمے نے لاپروائی سے جواب دیا "تمہاری ملکہ کیا جانے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے، اب میں تمہارے جسم کے بڑے نازک حصے پر کام کر رہا ہوں، نیم گولائی، مخصوص ابھار، یہ شکنیں اور تمہارے پیٹ کا یہ خم، آخر ان تمام باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا یا نہیں؟"

ہلینا شرما کر خاموش ہو گئی۔ ان دونوں کی یہ قربت ملکہ کی تنبیہ کے باوجود رنگ لائی۔ وہ یہ چاہنے لگی کہ یہ نوجوان مجسمہ ساز صرف کام ہی نہ کرے بلکہ اس سے کچھ باتیں بھی کرے، کچھ ایسی باتیں دوشیزائیں جن کے خواب بچپن سے دیکھا کرتی ہیں۔ پرڈمے کی سرد مہری سے وہ کچھ چڑنے لگی تھی، حیرت تھی کہ اس کا نیم عریاں جسم بھی پرڈمے میں جرأت اور گستاخی کا جذبہ بیدار نہ کر سکا تھا، لوگ تو اس جذبے اور شوق پر اپنی جانیں تک قربان کر دیتے ہیں، اور پھر یہ نوجوان سنگتراش تو ایک بھرپور مرد ہے۔

آخر تنگ آ کر ہلینا ہی کو بولنا پڑا "یہ تم جانتے ہو ملکہ اپنے اور اپنے بیٹے سکندر کے سوا کسی دوسرے کی محبت اور عشق سے کیوں چڑتی ہے؟"

پرڈمے کے ہاتھ کی ہتھوڑی گرتے گرتے بچی، یکایک ہلینا نے کچھ عجیب سی بات شروع کر دی تھی، وہ کچھ نہ بولا، بس ہلینا کی صورت دیکھنے لگا۔

ہلینا نے شوخی سے مسکرا کر کہا "وہ دوسروں کی محبت سے اس لئے چڑتی ہے کہ آج کل فلپ اس پر کم مہربان رہتا ہے۔"

پرڈمے نے جواب دیا "جہاں اختیار اور اقتدار ہوگا، وہاں محبت نہیں ہو سکتی۔"

ہلینا اپنی ہی کہے گئی "جب میں یہاں سے واپس جاتی ہوں تو ملکہ نہایت اشتیاق سے ایک ایک بات دریافت کرتی ہے، وہ ہر روز مجھ سے پوچھتی ہے کہ آج تم نے مجھ پر کتنا کام مکمل کیا ہے۔ وہ یہ معلوم کر رہی تھی کہ سارے وقت تم مجھے سامنے بٹھا کر مجسمہ سازی ہی کرتے رہتے ہو یا کچھ باتیں بھی کرتے ہو، دراصل باتوں سے اس کی مراد عشق و محبت کی باتیں ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ اس طرح ہنسی کہ دانتوں کی چمک سے گویا بجلی کوند گئی۔

پرڈمے نے اچانک سوال کیا "پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

ہلینا نے جلدی جلدی پلکیں اس طرح جھپکائیں کہ پروسے کو دیکھتی بھی رہی اور شرم و حیاء بھی برقرار رہی، بولی۔
"میں نے بھی بدل کر کہہ دیا کہ نوجوان مجسمہ ساز طبعاً بوڑھا ہے اور اس کے سینے میں دل کی جگہ برف کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے"

"اچھا!" پروسے نے ہاتھوں کی ہتھوڑی اور سمتی ایک طرف رکھ دی "لیکن تم نے یہ بات غلط کہی کہ میرے سینے میں دل کی جگہ برف کا ٹکڑا رکھا ہے، تم جانتی ہو کہ میں نے ملکہ سے ایک وعدہ کیا ہے، میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ میں تمہیں سامنے بٹھا کر صرف مجسمہ سازی کا کام کروں گا ورنہ کسی کو کیا معلوم کہ میرے سینے میں کیسے کیسے طوفان اٹھ رہے ہیں اور دل میں کیسا ہنگامہ برپا ہے!"

ہلینا نے شوخی سے کہنے لگی "لیکن جب تم ملکہ سے باتیں کر رہے تھے، اس وقت میں بھی تو وہیں موجود تھی، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے ملکہ سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، ہاں ملکہ نے اس سے باز رہنے کا حکم البتہ دیا تھا"
پروسے نے کہا "جب اس نے مجھے یہ حکم دیا تھا تو میں خاموش ہو گیا تھا گویا چپ رہ کر میں نے ملکہ سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ جو چاہتی ہے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے گا"

ہلینا نے اداس ہو کر کہا "تم ایک بزدل آدمی ہو کیا واقعی تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے باتیں کرو۔ اس فضا سے میرا دم گھٹتا ہے"

پروسے میں ذرا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس نے معصومیت سے دریافت کیا "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے"

"یہ تم خود سوچو!" ہلینا نے بے رخی سے کہا "یہ بادشاہ ملکہ بھی عجیب ہوتے ہیں، ان کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ یہ چاہتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے ان کے احکام کی تعمیل کی جائے یہ سب کچھ خرید سکتے ہیں لیکن دل پر تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ دلی معاملات میں بھی دخل اندازی کریں"

پروسے کی سمجھ میں ہلینا کی بات آ گئی لیکن ملکہ کا درشت اور خشونت آمیز چہرہ تصور کے سامنے آ گیا، بولا "ہلینا! ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہمارے جسموں پر بادشاہ یا ملکہ کا مالکانہ تصرف انہیں ظالم اور جابر بنا دیتا ہے اور وہ اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ ان کی زبان سے نکلے اس پر بے چون و چرا عمل درآمد ہو، حکم سے سرتابی کا ان کے ہاں ایک ہی مفہوم ہوتا ہے، سرکشی، تمرد، بغاوت اور ہمیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ سرکشی تمرد اور بغاوت کی یہ بادشاہ یا ملکہ کیا سزا دیتے ہیں!"
ہلینا نے مایوس لہجے میں کہا "ان محلوں میں میرا جی نہیں لگتا، تم کسی طرح مجسمہ سازی کا کام ختم کر لو اس کے بعد میں یہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہروں گی، سنتی ہوں، اسپارٹا کے بہادر لوگ عورتوں کی بڑی عزت کرتے ہیں اور وہاں کے حکمران لوگوں کے قلبی معاملات میں دخل نہیں دیتے"
پروسے نے کہا "اگر ایسا ہے تو تمہارے ساتھ میں بھی اسپارٹا نکل چلوں گا!"

ہلینا نے کہا "تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے، ابھی تمہیں سکندر کا مجسمہ بنانا ہے، اور اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ ملکہ خود اپنے مجسمہ کی تیاری کی فرمائش کر بیٹھے "

پیرومے نے سادہ لوحی سے کہا "میں سکندر کا مجسمہ تو ضرور تیار کر دوں گا لیکن اس کے بعد کوئی اور خدمت ہرگز نہ قبول کروں گا "

"تم بہت سادہ لوح آدمی ہو!" ہلینا کہنے لگی "کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم اس محل میں رہ کر اپنی مرضی کے مالک ہو؟ تمہیں بد دماغ ملکہ کا ہر حکم ماننا پڑے گا، تم اس کی مرضی کے بغیر یہاں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس محل میں ہم سب قید ہیں، غلام ہیں "

پیرومے کو واقعی پسینہ آنے لگا۔ اس نے آہستہ سے دریافت کیا "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

ہلینا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا "وعدہ کرو کہ میں تمہیں جو مشورہ دوں گی اس پر آنکھ بند کر کے، اور نڈر اور بے خوف ہو کر عمل کرو گے "

پیرومے نے جواب دیا "میں وعدہ کرتا ہوں!"

"کوئی خوف، یا کوئی مصلحت تمہارے آڑے نہ آئے گی؟"

"بالکل یہ میرا وعدہ ہے میں وعدہ کرنے کو بھی تیار ہوں کہ تم جو کہو گی اس پر عمل کروں گا "

ہلینا کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا "اب مجھے یقین آیا کہ تم میرے بارے میں سوچتے رہے ہو "

پھر کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے، پیرومے کی نظریں ہلینا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں، وہ منتظر تھا کہ ہلینا اس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ وہ جو کچھ کہنے والی ہے کس طرح اور کن الفاظ میں ادا کرے کہ اس کا پیرومے پر خاطر خواہ اثر پڑے اور وہ اسے پوری قوتِ ارادی اور ہمت سے مان بھی لے۔

کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ اس کی آواز اس طرح سنائی دی، جیسے کوئی نیند میں بے تعلقانہ انداز میں بڑبڑا رہا ہو۔

"ملکہ نے ہم دونوں پر پابندی عائد کی ہے کہ ہم مجسمہ سازی کے دوران ایک دوسرے سے بے تعلق رہیں گے اور اپنے دلوں کو عشق و محبت کی جولانیوں سے محفوظ رکھیں گے۔ سنو! میرا سرکش دل ملکہ کا یہ حکم مسترد کر چکا ہے، خود ملکہ نے مجھے تمہارے پاس بیٹھنے کا حکم دیا ہے، ہم سب ان کے کھلونے ہیں، ان خونیں بام و در میں بہت عرصے کے بعد باہر کا ایک آدمی، تم آئے ہو اور آج تک مجھے کسی مرد سے اتنی قربت کا موقع نہیں ملا۔ میں سمجھتی ہوں تمہارے اندر ایک مثالی مرد کی تمام خصوصیات موجود ہیں، پھر تم کیوں ان عظیم الشان بام و در کے مطیع رہو جن کی بنیادوں میں انسانی خون شامل ہے، پھر کچھ تند جذبے میں بولی "پتہ نہیں اس قربت نے تمہارے دل پر کیا اثر کیا ہے، تمہارا دل اب تک کسی جنونی جذبے سے آشنا ہوا یا نہیں، میں تمہاری آنکھیں دیکھ رہی ہوں، اگر کوئی گداز تم محسوس کرتے ہو تو ملکہ کے غیر فطری اور غیر انسانی حکم پر کیوں اپنا خون جلاتے

ہو، مجھے ملکہ سے نفرت ہوگئی ہے، یہ انا اور ضد کی بات ہے، تم مصنوعی طور پر سہی مگر ملکہ کا حکم ٹھکرا دو اور مجھے دیکھو میں تمہارے سپرد نہ ہوئی تو ان متلون مزاج، ظالم بادشاہوں کی نذر کر دی جاؤں گی، میں ان کی گرم آغوش میں پگھل جاؤں گی اور ختم ہو جاؤں گی۔"

پرڈسے نے ہلینا کی باتوں کو پوری توجہ سے سنا اور اسے یقین نہ آیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ ہے ممکن ہے اس کے اندر سے اولمپیاس جو ضدی، خود سر، خود نما اور خود پسند ہے اور جسے یہ جاننے کی جستجو ہوگی کہ اس نے پرڈسے کو جو حکم دے رکھا ہے وہ اس پر پوری طرح دل سے کاربند ہے یا نہیں، وہ بول رہی ہو۔

اس نے ہلینا کو گہری نظروں سے دیکھا اور دریافت کیا "کیا یہ تمہارے دل کی آواز ہے؟ کیا تمہیں ان باتوں پر کہیں اولمپیاس نے تو نہیں اکسایا ہے؟"

ہلینا کو پرڈسے کے شبہ پر دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا "تم سے تمہارا یقین چھن گیا ہے اس لئے تم خوفزدہ رہتے ہو، میں اداکاری کیوں کروں گی؟"

اچانک پرڈسے کو یہ احساس ہوا کہ آج کوئی کام تو ہوا ہی نہیں، بس باتیں ہی ہوتی رہیں۔ اس نے فوراً ہتھوڑی سنبھالی اور چھینی اور سمتی پر چوٹیں پڑنے لگیں، ہلینا کے چہرے پر مایوسی چھا گئی، اس نے چڑ کر دھمکی دی "پرڈسے! اگر تم اب بھی کچھ نہیں سمجھے تو تم سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں، میں کل سے نہیں آؤں گی۔"

پرڈسے کا ہاتھ ایک بار پھر رک گیا "ایسا غضب بھی کبھی نہ کرنا، بس ہفتے عشرے کی بات اور ہے، مجسمہ تیار ہونے ہی والا ہے۔"

ہلینا نے کہا "مجھے ایسے آدمیوں سے سخت نفرت ہے جو حسن سے صرف عالم خیال ہی میں لطف اندوز ہونے کے عادی ہوتے ہیں!"

لیکن پرڈسے نے جیسے اس کی کوئی بات سنی ہی نہ ہو، اس کے ہاتھ ہتھوڑی، سمتی اور چھینی سے کام لیتے رہے، جب کام کا وقت ختم ہو گیا تو پرڈسے آگے بڑھا اور سرگوشی میں پورے جذبے کے ساتھ بولا "ہلینا! تم میرے لئے ہلینا نہیں ثمر بنہ ہو، تم نہیں جانتیں کہ میں تمہارے لئے کیا محسوس کرتا ہوں اور جبر کرتا ہوں، تم ذرا خاموش رہو۔ جب میں سکندر کا مجسمہ تیار کر چکا ہوں گا۔ تو اس کے صلے میں اولمپیاس سے تمہیں مانگ لوں گا۔" پھر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر آزردہ ہنسی ہنستا ہوا بولا "لیکن یہ ساری باتیں قبل از وقت ہیں، معلوم نہیں اس وقت تک کیا ہو؟ جب محلسرا ابن سکندر کے لئے اس کی ماں خود ہی عورتوں کے جال بچھا رہی ہے تو معلوم نہیں اس وقت تک کون کہاں اور کیا ہو؟"

ہلینا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "تم میرا مجسمہ تیار کر رہے ہو، اس عرصے میں، میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے، تمہارے فن اور تمہاری معصومیت نے مجھے باغی کر دیا ہے۔ تم مرد ہو، جن کے لئے مشہور ہے کہ ان میں ضبط اور برداشت کا زیادہ حوصلہ نہیں ہوتا لیکن تم اس کے برعکس ہو، اور میں جو عورت ہوں، یہ برداشت نہ کر سکی، میں نے وہ سب کچھ کہنے میں پہل کی جس کی ابتداء تمہاری طرف سے ہونا چاہیے تھی۔"

"اچھا اب تم جاؤ، اس سلسلے میں کل باتیں ہوں گی!" پرڈسے نے اس جذباتی لڑکی کو ٹالنے کی کوشش کی۔
ہلینا واپس جاتی ہوئی بولی "رات کو میری باتوں پر سوچنا۔ یونان میں محبت کرنا کوئی جرم یا معیوب فعل نہیں ہے یہ جذبا پیدائشی حق ہے اگر میں کچھ محسوس نہ کرتی اور میں تم سے صرف مطلب نکالنا چاہتی تو تمہارے کھنچاؤ پر نہایت آسانی سے ملکہ سے شکایت کر سکتی تھی کہ تم ملکہ کی حکم عدولی کر رہے ہو اور مجھ سے نشن کرنے لگے ہو۔"
پرڈسے نے جواب دیا "تم شرمینہ کی جگہ ہو ہلینا، شرمینہ کے بعد اگر کوئی لڑکی مجھ پر تسلط جمائے گی تو وہ تم ہو، لیکن اس کے اظہار کا یہ مناسب موقع نہیں، تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ کچھ ضبط کرو۔"
دوسرے دن ہلینا نے کہا "پرڈسے!" ہلینا نے اس کے دل میں آگ لگانی چاہی "آج رات وہ بدترین تماشا ہونے والا ہے، ملکہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آج کسی بھی طرح سکندر کو اپنی طرف راغب کر کے داد عیش دوں ملکہ سمجھتی ہے کہ اس کے بیٹے کی جوانی تشنہ ہے اور اسے سیراب کرنا چاہیے۔"
اس کا جی چاہا کہ وہ ہلینا کو لے کر اسی وقت کہیں فرار ہو جائے لیکن ایسا ممکن ہی نہ تھا، اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔
"تو کیا تم واقعی سکندر کے تشنہ شباب کو سیراب کرو گی؟"
"میں اسی لئے خریدی گئی ہوں، غالباً ہماری کل کی باتیں ملکہ تک پہنچ گئی ہیں۔"
"تم ملکہ سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں یہ کام نہیں کر سکتی؟"
"اتنی سی بات کہنے کے لئے غیر معمولی حوصلے کی ضرورت ہے، مجھے وہاں جانا ہو گا۔" ——— پرڈسے نے کچھ دیر سوچا، پھر کہنے لگا "ہلینا! ابھی تھوڑی دیر پہلے تک ——— میں تمہارے باب میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ان حالات میں اچانک ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ تم میرے اندر رچ بس گئی ہو۔" پھر کچھ رک کر بولا "کیا ایسا ممکن ہے کہ جب تم سکندر کو لبھانے اور اپنی طرف راغب کرنے کا فرض انجام دے رہی ہو تو میں بھی وہیں کہیں آس پاس رہ کر اس منظر کو دیکھ سکوں؟"
ہلینا نے اداسی سے پوچھا "یہ کیوں؟ کیا یہ منظر بہت دلکش ہو گا؟"
"نہیں۔ بس یونہی میں وہاں رہنا چاہتا ہوں۔" پھر پوچھا "تو کیا ہو گا؟"
"پھر کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم کوئی ایسا غلط قدم اٹھا بیٹھو گے تو میری اور تمہاری دونوں کی تباہی آ جائے گی، دیکھو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہر قیمت پر سکندر کی ہوس سے محفوظ رہوں گی!"
پرڈسے اداس ہو گیا "یہ کس طرح ممکن ہے تم اس نشاط کدے میں جا کر سکندر کو ترغیب، ہوس سے کیسے روک سکو گی۔"
"سکندر کو ترغیب ہوس سے کیسے روک سکو گی؟"
"سکندر ایک نیک دل شہزادہ ہے۔ میرا خیال ہے وہ مجھ پر رحم کرے گا۔"
پرڈسے سرد لہجے میں بولا "ہلینا! اگر آج رات تم سکندر کی ہوس کا شکار ہونے سے محفوظ رہو گی۔ تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجسمے کی تیاری کے فوراً بعد میں تمہیں لے کر اسپارٹا چلا جاؤں گا۔"

"پرڈٹ۔ میں اس سے بچنے کی کوشش کروں گی!" پھر جاتی ہوئی بولی، "میں غروب آفتاب سے پہلے کسی بھی ذریعے سے تمہیں سکندر کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں بلوالوں گی تم وہاں سے یہ دیکھ سکو گے کہ اس محلسرا کی عورتیں کس طرح ملکہ کے حکم کی تابع ہیں، مگر خبردار تم خود کو قابو میں رکھنا، میں تمہیں اس لئے بھی وہاں بلانا چاہتی ہوں تاکہ تم میری باتوں پر یقین نہ کرو بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ میں وہاں سے پاکباز لوٹی ہوں، ممکن ہے بعد کو تمہیں یقین نہ آئے!"

پرڈے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی لمحے اسے شرمینہ یاد آئی جو محل میں شہنشاہ ایران کے جبر کی پابند زندگی گزار رہی تھی لیکن اس نے اس لمحہ ایک عجیب کیفیت محسوس کی ——— جب وہ اس کش مکش سے بیدار ہوا اور اس نے سر اٹھا کر ہلینا کو دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

پرڈے انتہائی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ہلینا کے معاملے میں سکندر سے خود مل لے اور زیوس دیوتا کے نام پر درخواست کرے کہ وہ ہلینا کو معاف کر دے، جب وہ میزا پہنچا تو ارسطو اپنے کئی شاگردوں کے ساتھ حوض کے کنارے زیتون کے سائے میں سوال جواب میں مصروف تھا۔ اس کے دائیں طرف سکندر کھڑا تھا۔ ارسطو کے ہاتھ میں عصا تھا جسے وہ بار بار زمین پر مار کر پوچھ رہا تھا "آخر ہم اپنے حواس خمسہ پر کس طرح بھروسہ کر سکتے ہیں جبکہ یہ ہمیں قدم قدم پر دھوکا دیتے ہیں!"

سکندر نے دریافت کیا "تو کیا جو ہم دیکھتے سنتے اور محسوس کرتے ہیں ان میں حقیقت نہیں ہوتی!"

ارسطو نے اپنا آبنوسی عصا زمین پر ڈال دیا "اب اس عصے کی مثال لے لو اگر تم اسے شام کے جھٹپٹے میں دور سے یوں پڑا دیکھو تو تمہاری نظر اسے سانپ باور کرائے گی گویا جو کچھ تم نے دیکھا اس میں صداقت نہیں تھی!"

اچانک ارسطو کی نظر پرڈے پر پڑ گئی اسے قریب بلایا، وہ پرڈے کی داستانِ عشق سن چکا تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں کے سامنے پرڈے کو کھڑا کر دیا اور کہنے لگا "یہ یقین کرنے پر تیار نہ ہو تا کہ یہ اس کی ایرانی محبوبہ کے سوا کوئی دوسری لڑکی ہے!"

اس طرح ارسطو نے پانچوں حواس کو غیر یقینی اور ناقابلِ اعتبار قرار دے دیا۔

اس علمی اور فلسفیانہ مجلس میں پرڈے کا دل گھبرا گیا! اور وہ ایسا مرعوب ہوا کہ جس مقصد سے وہاں پہنچا تھا اس کے لئے زبان ہلانا تک مشکل نظر آنے لگا۔ ارسطو اچانک پرڈے سے مخاطب ہوا "اگاتھان کے بیٹے! تو یہاں کیوں آیا ہے؟"

پرڈے سے کوئی جواب نہ بن پڑا کہنے لگا "دانشمند ارسطو کی باتیں سننا چاہتا تھا اور موقع نہ ہونے کے باوجود یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ عقلمند استاد عشق کی بابت کیا کہتا ہے؟"

ارسطو نے پرڈے کو دیکھ کر اپنے شاگردوں کو سرسری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا "عشق لازمۂ حیات ہے!" پرڈے کے چہرے پر تازگی پیدا ہو گئی "لیکن کیا عشق ہے اور کیا نہیں، اس کی تمیز ہر شخص نہیں کر سکتا!" ارسطو کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی، اچانک اس نے سکندر کی طرف اشارہ کیا "یہ سکندر جو مقدونیہ کا ولی عہد ہے اس کا عشق عورتوں میں نہیں ظاہر ہونا چاہیے۔ ہر بادشاہ جتنی عورتیں چاہے اپنے حرم میں ڈال لے لیکن کسی بادشاہ کے لئے اس کے محل سرا میں عورتوں کی

کثرت باعثِ افتخار نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہمت، استقلال، اس کا غیر معمولی کام، انتھک جدوجہد اور ناقابلِ شکست عزیمت ہی اس کا زیور ہوتا ہے۔"

سکندر نے دریافت کیا: "لیکن ایک فاتح بادشاہ اگر عورتوں سے لطف و لذت حاصل کر کے اپنی تھکاوٹ اور طبیعت کی بدمزگی دور کرے تو کیا حرج ہے؟"

ارسطو نے اپنا عصا زمین سے اٹھا کر کئی بار زور زور سے زمین پر مارا اور کہنے لگا "بس اس میں ایک ہی قباحت ہے۔ وہ بادشاہ جو اپنے گرد و پیش فاتح بن کر ابھرتا ہے جب اپنی کلفتیں اور تھکاوٹیں عورتوں کی مجلس میں بیٹھ کر دور کرنے لگتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب وہ فاتح نہیں رہا مفتوح ہو چکا ہے۔ وہ فاتح جو غنیم کی مردانہ سپاہ کو شکستیں دے کر فاتح ہونے کا اعزاز حاصل کرتا ہے، عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہو کر اپنا یہ اعزاز کھو بیٹھتا ہے۔ عشق مسخر کرتا ہے، مسخر ہوتا نہیں۔"

سکندر کی گردن جھک گئی۔

اس موقع پر ارسطو سکندر کو عقل کی کچھ اور باتیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے بطورِ خاص سکندر کو مخاطب کیا "سکندر!"

سکندر نے سر اٹھایا اور عقیدت مندانہ نظروں سے استاد کو دیکھنے لگا۔

ارسطو نے کہا "سکندر! فلپ کے بعد مقدونیہ کے علاوہ شاید تمہیں پورے یونان کی قیادت کا بوجھ اٹھانا پڑے۔ جب تمہارے کاندھوں پر یہ بوجھ آ پڑے تو تمہیں دو طرح کے دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا، ایک تو وہ جو سامنے سے آ کر فولاد کے ہتھیاروں سے تم پر حملہ آور ہو گا اور دوسرا وہ جو روباہ صفت ہو گا بالکل لومڑی کی طرح اس کے حملے حسن، عیاری اور عقل کے حربوں سے پشت کی طرف سے کئے جائیں گے۔ دنیا کے عظیم فاتح ایسے ہی دشمنوں کی فہرست میں عورت کا نام سرِ فہرست ہے!"

پرمے کا دل گھبرا گیا، وہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا۔ وہ کسی طور پورا نہیں ہوا چاہتا تھا چنانچہ وہ وہاں سے واپس آ گیا۔

غروبِ آفتاب کے بعد ایک کنیز اس کے پاس پہنچی اور خادم کا بھیس بدلوا کر محل کے پیچیدہ راستوں سے گزرتی ہوئی ایک ایسے کمرے میں لے گئی، جس سے ملحق کمرے میں سکندر رہتا تھا، اس نے پرمے کو وہاں چھوڑ دیا اور کہنے لگی "سامنے دروازے کے پاس جا کر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ احتیاط رکھنا کہ تمہیں کوئی دیکھ نہ پائے۔"

پرمے میں اب اتنا حوصلہ بھی نہ رہا تھا کہ ملکہ کے حکم کے خلاف کوئی حرفِ احتجاج تک زبان پر لاتا۔ وہ دھیرے دھیرے چل کر دروازے کے پاس پڑے ہوئے تین پایوں کے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازے کی زنجیر کو غور سے دیکھا وہ کھلی ہوئی تھی لیکن جب دروازے کے ایک پٹ کو اپنی طرف آہستہ سے کھینچ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ دوسری طرف سے بند ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں دروازے کی جھری سے لگا دیں: دوسری طرف کا منظر ہی کچھ عجیب تھا وہاں ہلینا کے علاوہ بھی کئی نہایت حسین اور فتنہ سامان قیامتیں نیم عریاں لباسوں میں انگڑائیاں لیتی پھر رہی تھیں، اس نے سوچا کہ دنیا کا کون ایسا مرد ہے جو یہاں

نے سے محفوظ رہے گا، ان کے بالوں میں قیمتی موتیوں کے ہار پروئے ہوئے تھے اور پتلی کمر کے گرد پیٹیوں سے ۔ بالائی لباس اس طرح کمر باندھا گیا تھا کہ اس کی اوپر کو اٹھتی ہوئی سلوٹیں سینے کی بلندیوں پر ختم ہو گئی تھیں اور ان میں تناؤ پیدا کر دیا تھا مختلف رنگوں کے ریشمی کپڑوں میں دنیا کے حسین بدن لپٹے ہوئے تھے، ترغیب کا یہ جال ایسا تھا کہ پروسے کو یقین ہو گیا۔ آج سکندر اس جال کو نہیں توڑ سکے گا لیکن یہاں ایک ایسی صورت بھی موجود تھی جس نے پروسے کی کچھ امید بندھا رکھی تھی، یہاں ہلینا کے علاوہ بھی لڑکیاں تھیں اور یہ ضروری نہ تھا کہ سکندر کی نظرِ انتخاب ہلینا ہی پر پڑے بہرحال پروسے کا ہاتھ کمر میں لٹکے ہوئے اپنے خنجر پر سخت ہوتا جا رہا تھا۔

تھوڑی سی دیر بعد ایک طرف سے سکندر نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ ان مہوشوں کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر لڑکی اپنے آپ کو پیش پیش رکھنا چاہتی تھی۔ ہلینا میں کچھ جھجک تھی لیکن ایسی کہ اسے پروسے ہی محسوس کر سکتا تھا، سکندر ان پری پیکروں کے بیچ سے گزر کر اپنی مسہری تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن ان میں سے کسی نے ذرا زیادہ جسارت سے کام لیا۔ ایک نے سکندر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے سینے پر رکھتی ہوئی بولی "شہزادے! اس کنیز کو کچھ عرصے سے کائنات کی ماہیت کے بارے میں ارسطو کے خیالات بے سروپا معلوم ہوتے ہیں۔ کیا شہزادہ، جو ارسطو کے پہلو میں رہتا ہے، میرے بے قرار دماغ کو حقائق سے آگہی کا شرف بخشے گا؟"

سکندر نے کھوکھلی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر جواب دیا "ارسطو میرا استاد ہے اور یہ نشاط کدہ بحثوں کے لئے نہیں بہرحال میں ارسطو تک تیرے خیالات پہنچا دوں گا۔ ارسطو تجھے مطمئن کر دے گا۔"

ایک دوسری کنیز آگے بڑھی اور اپنی باہیں سکندر کے گلے میں ڈال دیں، "شہزادے! شاید ارسطو بہت زیادہ تھکا ڈالتا ہے، میں تمہیں ایتھنز کی بہترین شراب پلا کر تمہاری تکان چشم زدن میں دور کر دوں گی۔"

سکندر نے اسے بھی دھکیل دیا اور کہنے لگا "جو شئے اعصاب اور اعضاء پر نشہ طاری کر کے تکان دور کرے اسے میں اپنے لئے کس طرح پسند کر سکتا ہوں۔"

جب سکندر اپنی مسہری کے قریب پہنچ گیا اس وقت بھی ترغیب ساماں کنیزیں اس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ ایک نے جھک کر سکندر کی چپلوں کے تسمے کھولنا شروع کر دیئے اور اس کی پنڈلیوں کو سینے سے لگا کر پیار کر لیا، کہنے لگی "جو پیر ارسطو کی درسگاہ سے چل کر آئے ہوں ان کی جتنی بھی عزت کی جائے کم ہے۔"

سکندر گھبرا گھبرا کر ان شکاریوں کو دیکھ رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر ان کے پھندوں کو توڑ کر آزاد ہوتا جاتا تھا، پھر سکندر نے انہیں ڈانٹ دیا "دور ہو صفت دشمنو! یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں تو ابھی فاتح بھی نہیں، میں مشکل پسند ہوں۔ اس شئے کو اپنے لئے حرام سمجھتا ہوں جو مجھے باسانی میسر آ جائے۔"

لیکن پروسے کا دل دھڑکنے لگا جب اس نے دیکھا کہ سکندر اچانک ہلینا کی طرف گھوم گیا۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ کے

اشارے سے اسے قریب بلایا۔ ہلینا سہمی سہمی ڈری ڈری سکندر کے قریب پہنچ گئی۔ پرڈمے کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

سکندر نے ہلینا کو روک لیا اور بقیہ کنیزوں کو حکم دیا وہ باہر چلی جائیں۔ اسی لمحے کسی طرف سے ملکہ نمودار ہوئی اور سکندر کو حکم دیا "بیٹے! اس محل میں جو کچھ ہے تیرا ہے، تجھے اپنی خواہشات کو مارنا نہیں چاہیے، تو تارک الدنیا فقیر نہیں شہزادہ ہے۔ یہ کنیزیں بھی تیرے ارد گرد اسی لیے منڈلاتی رہتی ہیں معلوم نہیں کسے یہ اعزاز حاصل ہو جائے اور وہ آئندہ زندگی بھر اس بات پر فخر کرتی رہے کہ اس نے مقدونیہ کے شہزادے اور زیوس دیوتا کے بیٹے کی سانسوں کو اپنے منہ پر محسوس کرنے کا امتیاز حاصل کیا ہے، یہ یاد رکھ حسین عورتیں بڑی مہمیں سر کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔"

سکندر مسکرایا اور جب ماں اپنی جھلک دکھا کر کہیں روپوش ہو گئی تو وہ اٹھا اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ ہلینا گم سم اس کے پاس کھڑی آنے والے لمحات سے خوفزدہ تھی۔

سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ہونٹوں تک لے گیا پھر کچھ سوچ کر چھوڑ دیا "لڑکی! تو وہی ہے نا جس کا اگا تھان کا بیٹا پرڈمے مجسمہ تیار کر رہا ہے؟"

"ہاں شہزادے!" ہلینا نے نظریں جھکا لیں۔

"ایک بات بتا!" سکندر نے اس کی ٹھوڑی کو انگلیوں سے اوپر اٹھایا۔

"پوچھئے!" سہمی ہوئی آواز ابھری۔

"کیا تجھے وہ نوجوان سنگتراش پسند ہے؟"

اس سوال سے ہلینا اور پرڈمے کا دل ایک ساتھ دھڑکنے لگا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو سکندر نے پھر پوچھا "میری بات کا جواب دو!"

ہلینا نے رک رک کر کہا "کنیز کو اس کے فن سے محبت ہے!"

"اچھا خوب!" سکندر ہنسنے لگا "تو یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ تجھے پرڈمے سے عشق ہے، یہ اس کے فن سے محبت کرنے کا کیا مطلب ہے؟" پھر جیسے خود سے کہنے لگا "لیکن لڑکی، تو میری ماں کی کنیز ہے تیرے پاس تیرا اپنا کچھ بھی نہیں، جسم، زبان کچھ بھی تیرا نہیں لیکن اگر تجھے آزادی حاصل ہوتی اور تجھے اپنی زبان پر اختیار حاصل ہوتا تو اس وقت تیرا جواب صاف صاف یہ ہوتا کہ تجھے پرڈمے سے محبت ہے تو اس سے عشق کرتی ہے!"

ہلینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فانوسوں کی تیز روشنی میں انہیں سکندر نے بھی دیکھ لیا۔ بولا "تو روتی کیوں ہے؟ میں نے تو تجھے کچھ بھی نہیں کہا تو محفوظ بھی ہے، بالکل امانت کی طرح، پرڈمے کی امانت کی طرح" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "لیکن ذرا ٹھہر نا تو، میرا خیال ہے تو غلطی پر ہے تو پرڈمے کو چاہتی ہے لیکن پرڈمے تو کسی ایرانی لڑکی پر عاشق ہے۔ استاد ارسطو کہتا ہے کہ عشق مسخر کرتا ہے ہوتا نہیں۔ کیا تو پرڈمے کو مسخر کر سکتی ہے؟"

ہلینا کوئی جواب نہ دے سکی، پرڈِمے کے دل میں سکندر نے ایسی جگہ بنالی جو وہ اپنے شاہی دبدبے اور اختیارات سے کبھی بھی نہ بنا سکتا تھا اور انہی لمحات میں اسے اس بات کا شدت سے اندازہ ہوا کہ وہ پوری طرح ہلینا کے دامِ الفت میں گرفتار ہو چکا ہے۔

سکندر نے ضدی نوجوان کی طرح پوچھا "تو جواب کیوں نہیں دیتی؟ کیا پرڈِمے بھی تجھے چاہتا ہے؟"

ہلینا نے آہستہ سے کہا "میرا خیال ہے وہ بھی ...!"

سکندر زیرِ لب ہنس دیا "خوب ہے یہ سنگتراش کہ بیک وقت دو لڑکیوں سے محبت کرتا ہے۔ تجھ سے بھی اور ایرانی لڑکی سے بھی!"

پرڈِمے کو سکندر کے ان فقروں سے شرم آئی اور اس نے سوچا کہ اگر ہلینا اسے واقعی مل گئی تو وہ شیرینہ کو بھول جانے کی کوشش کرے گا لیکن اسی لمحے کسی نے اس کے کان میں کہا کہ اگر دونوں ہی مل جائیں تو کیا بُرا ہے؟

سکندر نے یہ کہہ کر ہلینا کو رخصت کر دیا "لڑکی! یہاں سے بھاگ جا۔ مجھے گمراہ نہ کر۔ ابھی میرے سامنے بہت سے کام پڑے ہیں، استاد ارسطو کی ہدایات ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں!"

اس رات پرڈِمے کی نیند اڑ گئی اور صبح ہوتے ہوتے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ شیرینہ اسے ملے یا نہ ملے لیکن وہ ہلینا کو ضرور حاصل کرے گا لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ اگر ملکہ کو اس معاشقے کا علم ہو گیا تو ان دونوں کا معلوم نہیں کیا حشر ہو؟ فکر و تشویش، اندیشے، لالچ اور تذبذب نے مل جل کر اس کے سر میں درد پیدا کر دیا تھا اور اذیتوں کے باوجود اس کا آخری فیصلہ یہی تھا کہ اسے نہایت ہوشیاری سے یہ جوا کھیلنا ہی پڑے گا۔

دوسرا دن یوں ہی گزر گیا لیکن ہلینا نہیں آئی ایک دن اور گزر گیا اور پھر اسی طرح پانچ دن گزر گئے، ہلینا نہیں آئی اور نہ ہی اس کے نہ آنے کا کوئی سبب معلوم ہو سکا۔ دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے رہے۔ اسے اپنی خبر نہ نظر آتی تھی، پھر اس نے یہ دیکھا کہ محل سے بہت سارا سامان ڈھل ڈھل کر کہیں جا رہا ہے، رتھ اور گاڑیاں دن بھر سامان ڈھوتی رہیں، اسی رات اولمپیاس نے اس طلب کیا۔ ملکہ کے خدمت گار نے اسے لے جا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا اور ایک کنیز اولمپیاس سے پرڈِمے کی حاضری کی اجازت لینے چلی گئی، اندر سے اولمپیاس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی وہ اپنے بیٹے سکندر کو زور زور سے کچھ نصیحتیں کر رہی تھی، اس نے سُنا، ملکہ سکندر سے کہہ رہی تھی "سکندر! میں کئی بار تجھے یقین دلا چکی ہوں کہ تو فلپ کا بیٹا نہیں ہے تو زیوس دیوتا کا فرزند ہے۔ تجھے اپنے آپ کو عام آدمیوں میں شمار نہیں کرنا چاہیے"

سکندر کی پریشان آواز سنائی دی "ماں! یہ تم کیا کہتی رہتی ہو، تم نہیں جانتیں، کہ تمہارے اس بیان کی روشنی

ہیں لوگ مجھے اپنے باپ کی ناجائز اولاد سمجھنے لگے ہیں، تم جو کچھ کہتی ہو اس پر بیشتر لوگ یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔"
اولمپیاس کہنے لگی "سکندر تو نہیں جانتا کہ میں شادی سے پہلے زیوس دیوتا کی پجارن تھی، میں جس مندر میں زیوس کی پرستش کے لئے جاتی تھی وہاں دیوتا فانی انسانوں کے روپ میں نمودار ہوا کرتے ہیں۔ وہیں شادی سے ایک رات پیشتر میں نے خواب دیکھا کہ رات کے وقت چلنے والی ہوا میرے کمرے میں داخل ہو گئی ہے تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی اور پھر ایک خاص قسم کی کڑک نے میرے گردو پیش کی دیواریں ہلا دیں، یکایک روشنی کی ایک کرن آسمان سے نمودار ہوئی اور اس نے میرے گرد احاطہ کر لیا۔ میرے آس پاس کی ہر چیز سے شعلے بلند ہونے لگے۔ سکندر! یقین کر اسی رات تو میرے شکم میں آ گیا۔ اس رات تک میں تیرے باپ فلپ سے دور تھی، پھر میں نے مندر کے بڑے کاہن سے اس خواب کی تعبیر معلوم کی تو اس نے مجھے یقین دلایا کہ میرے پیٹ میں آنے والا بچہ زیوس دیوتا کا بیٹا ہے۔"
پھر وہ کچھ دل شکستگی سے نصیحت کرنے لگی "اب یہ تیرا فرض ہے کہ تو اپنے قول اور عمل سے زندگی بھر یہ ثابت کرتا رہے کہ تو کسی فانی انسان کا بیٹا نہیں ہے، بلکہ ایک لافانی دیوتا نے تجھے جنم دیا ہے۔"
سکندر کو جیسے اپنی ماں کی باتوں کا اچھی طرح یقین نہ آیا "ماں! میں مندر کے بڑے کاہن سے تیرے بیان کی تصدیق ضرور چاہوں گا۔"
"شوق سے خوب اچھی طرح تصدیق کر لے، بڑا کاہن بھی یہی کہے گا جو میں نے تجھ سے بیان کیا ہے بھلا ہم فانی لوگ لافانی دیوتاؤں پر افترا کس طرح باندھ سکتے ہیں؟"
اس کے بعد خاموشی چھا گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد پرومے کو بھی اندر طلب کر لیا گیا۔ وہ ملکہ سے نگاہ ملاتے ہی لرز گیا۔ اس وقت وہ بڑے غصے میں تھی، پیشانی شکن آلود تھی، بھنویں چڑھی ہوئی تھیں، ہونٹ غصے سے سکڑ گئے تھے۔ آنکھوں سے لپٹیں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں، اس کے پیچھے ہلینا مغموم، اداس اور خوفزدہ کھڑی ہوئی تھی، سکندر جا چکا تھا، چند دوسری کنیزیں ادھر اُدھر بے تعلق کھڑی تھیں۔ اولمپیاس کے فوراً بعد پرومے کی نظریں ہلینا پر پڑیں، وہ ہاتھ اور گردن کے اشارے سے کسی بات سے منع کر رہی تھی۔
اولمپیاس اسے دیکھتے ہی برس پڑی "بے ہودہ اور نافرمان سنگتراش! جب تم نے مجھ سے ہلینا کے مجسمے کی تیاری کی اجازت چاہی تھی تو کچھ یاد ہے کہ میں نے اجازت دیتے ہوئے کیا حکم دیا تھا؟"
پرومے نے آہستہ سے جواب دیا "ناچیز نے ملکہ معظمہ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کی!"
ملکہ غصے میں اٹھی اور کسی گوشے سے ایک چابک اٹھا لائی، اور چیخ کر بولی "تو جھوٹ بولے گا تو میرا یہ چابک تجھ سے زبردستی سچ بلوائے گا"، اس کے بعد یکایک ہلینا کی طرف گھوم گئی اور چیخ کر کہنے لگی "ہلینا خود سر کمینی ادھر آ، میرے سامنے اس سنگتراش کے روبرو میں دیکھتی ہوں تو مجھ سے کس طرح جھوٹ بولے گی۔"

ہلینا بے چون و چرا دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہو گئی۔
ملکہ نے ہلینا کو ڈانٹا "ہلینا یہ سنگتراش جھوٹا ہے اسے ذرا اس دن کی وہ ساری باتیں سنانا جو تم دونوں میں ہوئی تھیں!"

ہلینا نے ساری ذمے داری اپنے سر لے لی اور جتنا کچھ بتا سکتی تھی۔ صاف صاف بتا دیا ملکہ سب کچھ سن کر کہنے لگی "ہاں تم دونوں احمق یہ سمجھتے ہو گے کہ ملکہ کو شاید تمہاری باتوں کا پتہ نہ چلے گا لیکن میں ملکہ ہوں، زیوس کی بیوی، میں عام عورتوں سے برتر اور اعلیٰ ہوں، فلپ صرف حکومت کرتا ہے یا جنگیں لڑتا ہے لیکن میں دنیا اور دنیا والوں پر نظر رکھتی ہوں، جہانبانی اتنی دشوار نہیں جتنی کار جہاں بینی!"
پروسمے اور ہلینا چوروں کی طرح گردن جھکائے کھڑے تھے،

اولمپیاس نے ہلینا کو پیٹنا شروع کر دیا" اور تیری یہ ہمت کہ تو نے میرے بیٹے کو باتوں میں بہلایا، میں جانتی ہوں کہ اس پر دانشمند ارسطو کے مکالمات کا بڑا اثر ہے لیکن تو اگر چاہتی تو ارسطو کے فضول مکالمات کا سحر توڑ سکتی تھی"
چابک کی ہر ضرب گویا پروسمے کے دل پر لگ رہی تھی۔ ہلینا جب چابک کی ضربوں سے بے حال ہو گئی تو وہ بھی چیخ پڑی "ملکہ! تم جتنا چاہو مار لو لیکن میں تمہارا یہ حق ہرگز تسلیم نہ کروں گی کہ تمہیں میرے دل پر بھی اختیار حاصل ہے میں اپنے دل کی خود مختار ہوں، جس سے چاہوں محبت کروں تم لافانی دیوتاؤں سے عشق کر سکتی ہو تو کیا مجھے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ کسی فانی انسان سے محبت کر سکوں"

پروسمے کو گمان گزرا کہ شاید اس زبان درازی کے جرم میں ہلینا کو ہلاک کر دیا جائے گا لیکن یکا یک وہاں ایک عجیب اور غیر متوقع انقلاب رونما ہوا۔ اسی وقت ایک کنیز فلپ کا ایک خط لے کر حاضر ہوئی اور اسے سوگواری سے اولمپیاس کی طرف بڑھا دیا۔ ملکہ نے چابک رکھ دیا اور اپنے شوہر فلپ کا خط پڑھنے لگی، پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا اور آخر نڈھال ہو کر کوچ پر گر گئی اور اس طرح دونوں آنکھیں بند کر لیں گویا پھر کبھی نہ کھولے گی، پورا ماحول سکوت اور سناٹے میں ڈوب گیا۔ بس ذرا ذرا سے وقفے کے بعد ہلینا کی سسکیوں کی آواز سکوت توڑتی رہی، پروسمے کنکھیوں سے ملکہ کی تبدیلی پر غور کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب اولمپیاس نے ریشمی تکیے سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور آنسو رواں تھے اور جب اس نے کچھ کہنے کے لئے آواز نکالی تو وہ بھرا رہی تھی، اس نے بدقت تمام ہلینا کو آواز دی "ہلینا یہاں آ میرے قریب"، ہلینا نے ذرا بھی جنبش نہ کی، جہاں کھڑی تھی، وہیں سسکیاں بھرتی رہی۔
اولمپیاس نے پھر نرمی سے پکارا "ہلینا! یہاں تو آ میرے قریب، میں ملکہ اولمپیاس نہیں تمہیں ایک عام عورت کی

حیثیت سے بلا رہی ہوں۔"

ہلینا نے جنبش کی اور اس نے ملکہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

اولمپیاس اٹھی اور آہستہ آہستہ چل کر ہلینا کے پاس پہنچ گئی۔ ہلینا دیوتا مجھ سے ناراض ہو گئے لیکن میں تم سے اپنی زیادتی کی معافی نہیں مانگوں گی، پھر سر جھکا کر اس نے پرڈسے کو مخاطب کیا "تم ہلینا کا جو مجسمہ تیار کر رہے تھے اب اس میں کتنا کام باقی ہے؟"

پرڈسے نے جواب دیا "سینے تک کا کام ختم ہو چکا ہے، اس کے بعد گردن، چہرہ اور سر پر کام کرنا ہے!"

"یہ سارا کام تم کتنے دنوں میں کر لو گے؟"

"مشکل سے دس دن میں!"

"اچھا" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی "کل تم مزدوروں کی مدد سے وہ مجسمہ میرے قبرستان کے قریب والے چھوٹے محل میں لے چلنا۔ بقیہ کام تمہیں وہیں انجام دینا ہے"، اس کے بعد ہلینا سے مخاطب ہوئی "کیا تم بھی میرے ساتھ اس محل میں چلنا گوارا کرو گی؟"

ہلینا نے کوئی جواب نہ دیا، وہ آزردگی اور بے بسی سے سسکیاں لے لے کر ملکہ کو کسی لمحے بس دیکھ کر رہ جاتی۔

"میں ملکہ تھی!" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی "مجھے تمہیں مارنے کا حق تھا لیکن اب تم ان اذیت ناک لمحات کو بھول جاؤ۔ میں بھی انہیں فراموش کئے دیتی ہوں" پھر جیسے عالم خواب میں بولی "میں تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری سنانا چاہتی ہوں ایک ایسی خوشخبری، جو میری زندگی کی بدترین، منحوس ترین خبر ہے" پھر آہستہ سے کہا "لو سن لو، اب میں ملکہ نہیں رہی، فلپ نے قلوپطرہ نامی کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر کے مجھے طلاق نامہ بھجوا دیا ہے اور اشاروں کنایوں میں مجھے یہ حکم بھی دیا ہے کہ میں نئی ملکہ کے لئے یہ محل خالی کر دوں" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

ہلینا، پرڈسے اور دوسری کنیزیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ملکہ کو دیکھنے لگیں، انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔

پھر اولمپیاس کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ بہت دور سے بول رہی ہو ——— لوگ چاہتے ہیں کہ میرا بیٹا سکندر فلپ کا جانشین نہ رہے، وہ اسے ولی عہدی سے ہٹانا چاہیں گے لیکن میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی، میں سکندر کی حفاظت کروں گی اور اس کے حق کے لئے جنگ کروں گی۔"

ملکہ نے محل خالی کر دیا اور ریشمی لباس اتار پھینکا، پرڈسے نے بہت سے مزدوروں اور رتھ کے ذریعے ہلینا کا مجسمہ نئے مکان کے صحن میں، فوارے کے قریب کھڑا کر دیا۔ یہ مجسمہ تقریباً پانچ فٹ اونچے چبوترے پر کھڑا کیا گیا تھا۔ بقیہ کام پورا کرنے کے لئے ہلینا بھی وہیں پہنچ گئی لیکن اسے ملکہ سے نفرت تھی وہ حتی الامکان یہ کوشش کرتی کہ اس کا سامنا

ملکہ سے نہ ہو لیکن جب کبھی سامنا ہو جاتا ملکہ اس سے یہی کہتی "جو کچھ ہوا اس کی اچھائی برائی سے مجھے کوئی بحث نہیں، لیکن میں اب بھی یہی کہوں گی کہ تو اس سنگتراش سے محبت نہیں کرے گی۔ اسے ابھی میرے بیٹے سکندر کا مجسمہ تیار کرنا ہے وہ اگر تیرے عشق میں مبتلا ہو گیا تو میرا کام کس طرح کرے گا۔"

دوسری طرف وہ پرومے کو دھمکی دیتی "فلپ نے مجھے طلاق دے دی تو کیا ہوا۔ وہ میرے بیٹے سکندر کا باپ تو اب بھی کہلاتا ہے۔ اس کے بعد میرا بیٹا ہی تو تاج و تخت کا وارث بنے گا۔ تمہیں شہر بدر سے بھی اچھی لڑکی فراہم کر دوں گی۔"

ہلینا کا مجسمہ مکمل ہو گیا تو پرومے کو یہ اطمینان ہوا کہ اب ہلینا محل واپس چلی جائے گی اور وہاں چند دنوں رہ کر اس کے ساتھ اسپارٹا کی طرف بھاگ نکلے گی، پرومے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ابھی اس نے سکندر کے مجسمے پر کام شروع بھی نہیں کیا تھا کہ سکندر کو اپنے باپ کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا، شاہی محل میں پورے یونان کی ریاستوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے، فلپ یونان کو متحد کر کے ایران پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ مہمانوں کے جشن میں سکندر بھی موجود رہے، سکندر نے جانے نہ جانے کے سلسلے میں اولمپیا سے مشورہ کیا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ سکندر کو ضرور جانا چاہیے لیکن نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے اعتبار کسی کا نہ کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اس نے پرومے کے ذمے یہ خدمت لگا دی کہ وہ سکندر کے ساتھ جائے اور اس کی حفاظت کرتا رہے۔

پرومے نے سکندر کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کی جو یونانی ریاستوں کے نمائندگان کے اعزاز میں دی گئی تھی یہیں اس نے حسین قلوپطرہ کو بھی دیکھا ایک الھڑ، شوخ، طرار اور چلبلی لڑکی جس کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ فلپ نے اس سے شادی تو بہت پہلے کر لی تھی لیکن اس کا انکشاف نہیں ہونے دیا تھا اور یہیں اس نے حسین قلوپطرہ کے چچا کو بھی دیکھا جو شراب کے پیالے پر پیالے چڑھائے چلا جا رہا تھا، یہیں ہلینا بھی نظر آئی جو قلوپطرہ کے آس پاس منڈلا رہی تھی، اس نے پرومے کو دیکھا اور نظر انداز کر گئی۔

یہاں سبھی شراب پی رہے تھے لیکن سکندر محفوظ تھا، قلوپطرہ کا چچا نشے میں دھت سکندر کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا، وہ سکندر سے نفرت کرتا تھا اس لئے کہ سکندر کی ماں، اس کی بھتیجی قلوپطرہ سے پہلے فلپ کی بیوی تھی اور سکندر فلپ کا ولی عہد تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ قلوپطرہ کی اولاد کے بجائے سکندر بادشاہ ہو جائے لیکن قلوپطرہ کے بچے کی پیدائش میں ابھی چند ماہ کی دیر تھی۔

قلوپطرہ کے چچا نے اپنی مخمور آنکھیں اٹھائیں اور لڑکھڑاتی آواز میں سکندر کو مخاطب کیا "تم شراب کیوں نہیں پیتے حالانکہ جب تم دیوتاؤں کے سوریہ وجاتے ہو تو ان کے قدموں میں خم کے خم لنڈھا دیتے ہو۔"

سکندر نے بے نیازی سے جواب دیا "میں اپنے زندہ و بیدار اعصاب اس شے کے حوالے کرنا نہیں چاہتا جو نیند کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔"

"خوب!" قلوپطرہ کے چچا نے اس کا مذاق اڑایا اور اپنے آس پاس کے ساتھیوں سے درخواست کی: "دوستو! تم سب دعا کرو کہ میری بھتیجی قلوپطرہ کے ہاں اولادِ نرینہ پیدا ہو تاکہ مقدونیہ کو اس کا جائز وارث مل جائے۔"

سکندر لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ اس وقت نہتا تھا غصے میں ہتھیار تلاش کرنے لگا اور آخر سامنے کی میز سے ایک پیالہ اٹھایا اور پوری قوت سے قلوپطرہ کے چچا کے منہ پر کھینچ مارا اور چیخا: "بدمعاش بوڑھے! تو مجھے ناجائز اولاد قرار دیتا ہے؟" اس کے بعد وہ میز پر چڑھ گیا اور قلوپطرہ کے چچا کی طرف لپکا لیکن اس دوران فلپ نے اپنے محافظ سے تلوار چھین لی اور نشے کی حالت میں اپنے بیٹے سکندر کی طرف بڑھا، پوری محفل میں افراتفری پھیل گئی اور یونانی ریاستوں کے نمائندے ہکا بکا یہ تماشا دیکھنے لگے۔

اس عالم میں پردے کو ایک طرف دھکیلتا ہوا ایک ننگے سر نوجوان سکندر کی طرف بڑھا اور اس سے جلدی جلدی درخواست کی "مقدونیہ کے جائز شہزادے! یہاں سے اسی وقت چلے جائیے ورنہ ڈر ہے کہ کہیں باپ بیٹے میں تلوار نہ چل جائے!"

سکندر غصے میں کانپ رہا تھا اور اس کا باپ فلپ تلوار لئے جوش میں بڑھا چلا آرہا تھا، اچانک اس کا پیر پھسلا اور وہ بچھے فرش پر اوندھے منہ گر گیا۔ سکندر نے باپ کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور دوڑ کر دروازے کے پاس پہنچ گیا اور وہاں سے یونانی ریاستوں کے نمائندوں کو مخاطب کیا "یہ شخص!" اس نے اوندھے منہ گرے ہوئے باپ کی طرف اشارہ کیا "تم اس سے یہ آس لگائے ہوئے ہو کہ یہ تمہیں ایشیا کے میدانوں میں لے جائے گا اور وہاں تمہاری قیادت کرے گا۔ اس میں تو اتنی قوت بھی نہیں ہے کہ ایک نشست گاہ سے اٹھ کر دوسری نشست گاہ تک اپنے پیروں سے جا سکے۔"

نمائندگانِ ریاست کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ فلپ آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، سکندر ایوان سے باہر نکل گیا۔ اس نے پردے کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو خود اعتمادی سے کہا: "میری ماں اب بھی مجھے بچہ ہی سمجھتی ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ایک معمولی سنگتراش میری حفاظت کر سکے گا اور یہ بھی کہتی ہے کہ میں زیوس دیوتا کا بیٹا ہوں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ میں سکندر ہوں، جسے کوئی فتح نہیں کر سکتا۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔"

سکندر اپنے گھوڑے بیوسی افلاس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے اسے آواز دی، سکندر نے گھوم کر دیکھا تو وہی ننگے سر نوجوان جس نے فرار ہو جانے کا مشورہ دیا تھا، دوڑا چلا آرہا تھا، وہ سکندر کے قریب آیا اور جلدی جلدی کہنے لگا "شہزادے! اب یہ دربار شرفا کے لئے موزوں نہیں رہا۔ اس بوڑھے خبیث، قلوپطرہ کے چچا نے ایک دن مجھے بھی

ذلیل کیا تھا مجھے اس سے انتقام لینا ہے۔" پھر سکندر کی ڈھارس بندھائی "شہزادے! تم اپنے باپ کی جائز اولاد ہو تم نہ گھبرانا، مقدونیہ کے تاج و تخت کے اصلی مالک تم ہی ہو، یہ لوگ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔"

سکندر نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "پوزانیا! میرے دوست! حوصلہ افزائی کا شکریہ لیکن تم ان شکاری کتوں سے ہوشیار رہو جو تمہارا پیچھا کر رہے ہوں گے اور موقع پاکر تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔!"

پوزانیا واپس چلا گیا۔ سکندر، پرومے کے ساتھ، سیدھا ماں کے پاس پہنچا، اولمپیاس بیٹھی چرخا کات رہی تھی جب سکندر نے اسے ساری روداد سنائی تو دونوں ماں بیٹے اسی وقت وہاں سے فرار ہو گئے۔ سکندر نے ماں کو تو اس کے آبائی مکان میں چھوڑا اور خود شمالی پہاڑوں میں چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اولمپیاس اور فلپ سے دور رہ کر مستقبل کے لئے کچھ بہتر ہی سوچ سکے گا۔ پرومے سکندر کے ساتھ ہی تھا، اس کا خیال تھا کہ کسی دن سکندر سے اجازت لے کر وہ ایتھنز واپس چلا جائے گا، رہ گئی ہلینا تو اس کے لئے پرومے کا انداز فکر مایوسانہ تھا، اس نے سوچا عشق اسے شاید اس نہیں آتا، شرمینہ کو پہلے ہی کھو چکا تھا، ہلینا کی حصولیابی بھی دشوار ہوتی جا رہی تھی، ابھی وہ سکندر سے علیحدگی کی بابت سوچ ہی رہا تھا کہ فلپ کے آدمی سکندر کو تلاش کرتے ہوئے پہاڑوں میں پہنچ گئے اور انہوں نے سکندر کو ایک چند سطری خط دیا۔ فلپ نے اسے فوراً واپس بلایا تھا، لکھا تھا۔ "سکندر میرے بیٹے! تم فوراً واپس آؤ اور فوج میں اپنا عہدہ سنبھال لو۔ یونانی نمائندگانِ ریاست مجھ سے کہتے ہیں کہ جب تم اپنے گھر کے لوگوں کو اکٹھا نہیں رکھ سکتے تو یونانی ریاستیں کس طرح متحد کرو گے؟ سکندر! تم مقدونی تاج و تخت کے جائز وارث ہو، تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

سکندر فوراً ماں کے پاس پہنچا اور اسے باپ کا خط دکھا کر مشورہ طلب کیا۔ سفید بیواؤں جیسے لباس میں ملبوس اداس اولمپیاس نے وقار سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے تم واپس جاؤ۔ گو میں فلپ پر اعتبار نہیں کرتی لیکن تجھے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ فرار تیرے شایانِ شان نہیں ہے۔" پھر فلپ کے دوستانہ رویے پر تبصرہ کرنے لگی "سکندر تیرے باپ کو لوگ روباہ صفت کہتے ہیں۔ یاد رکھ روباہ صفت انسان اس وقت بہت ہی خطرناک ہوتا ہے جب وہ اپنی روش انتہائی دوستانہ بنا لے تو واپس جا، آسمانی طاقتیں تیری حفاظت کریں گی۔ تجھے ان طاقتوں پر بھروسا کرنا چاہیے جو فانی انسانوں کی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں۔" پھر پرومے سے کہنے لگی "اس انتشار کے فوراً بعد تجھے سکندر کا مجسمہ تیار کرنا ہے۔ تیرا مستقبل محفوظ ہے۔"

سکندر اسی وقت باپ کے پاس روانہ ہو گیا۔ فلپ اس کے استقبال کو آگے بڑھا، بیٹے کو سینے سے لگالیا اور دیر تک اسے نصیحت کرتا رہا، پھر جب رات کو سکندر اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان کھویا ہوا تھا تو اچانک فلپ پہنچ گیا۔ اس نے ناخوشگوار لہجے میں بیٹے کو سمجھایا۔ "سکندر! مجھے ان کتابوں سے نفرت ہے، تمہارے استادوں نے تمہیں گمراہ کر دیا ہے، کاش میں ارسطو اور لیونی ڈس کو تمہارا اتالیق نہ بناتا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔" پھر اس نے روغن فانوسوں پر

نظریں گاڑ دیں اور انتہائی حسرت اور نرمی سے سمجھانے لگا "نہیں میری افواج کی قیادت کرنی ہے ؟ نہیں نذرانہ دینے والے دیوتاؤں کی معجزانہ اعانت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، یہ دیوتا کچھ بھی نہیں کریں گے، جو کچھ کروگے تم خود کروگے!"

لیکن سکندر نے باپ کی نصیحتیں اس طرح سنیں جیسے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی ہوں۔

سکندر کی سوتیلی بہن کی شادی ہو رہی تھی، اس موقع پر ہلینا بچ بچا کر پرڈسے سے ملی اور اسے مشورہ دیا کہ یہ فرار کا بہترین موقع ہے، محل کے لوگ شادی کے ہنگاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اس کے ساتھ نہایت آسانی سے فرار ہو سکتی ہے؟ لیکن پرڈسے اس پر تیار نہیں ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اب حالات سدھرنے جا رہے ہیں اور شاید وہ دن دور نہیں جب یونانی افواج فلپ یا سکندر کی قیادت میں، حشرت الارض کی طرح ایشیا کے میدانوں میں پھیل جائیں گی۔ اور وہ ان کے ساتھ استخر پہنچ جائے گا۔ جہاں شرینہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ پرڈسے دراصل تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔ جو چیز اسے بہ آسانی مل سکتی تھی اسے چھوڑ کر دوسری مشکل شے کی آرزو کر رہا تھا۔

ہلینا اس کی ٹال مٹول سے ناخوش ہوئی، کہنے لگی "شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ یونانی افواج ایشیا میں فاتح بن کر داخل ہوں گی ایسا ناممکن ہے کیونکہ ایران کا بادشاہ کئی بار یونانی ریاستوں کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا ہے اس کے علاوہ یونانی ریاستوں کا پانی اور مٹی شہنشاہ ایران کے مرتبانوں میں اس بات کی علامت کے طور پر محفوظ ہیں کہ یہ علاقے اس کے زیر نگیں اور محکوم ہیں"

پرڈسے نے کہا "لیکن اب شاید یونان آزادی حاصل کرلے!"

ہلینا نے غصے میں جواب دیا "تم پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے والے خیالی سنگتراش ضرور کہیں ایشیا میں جا کر گم ہو جاؤ گے اور میں تمہارا انتظار کرتی رہ جاؤں گی"

پرڈسے نے شرینہ کے تصور میں جواب دیا "اگر میں واقعی ایشیا میں کہیں گم ہو جاؤں تو تمہیں یہ اختیار حاصل ہوگا کہ تم کسی دوسرے مرد کو میری جگہ عطا کر دینا"

"ہاں یہ بہت آسان ہے"، ہلینا نے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں "اور ایران پہنچ کر شاید تم بھی کرو، لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا انتظار کروں گی۔ یہ کوئی شاعرانہ وعدہ نہیں ہے میرے دل و دماغ کا متحدہ فیصلہ ہے"

پرڈسے اسے غمگین اور افسردہ چھوڑ کر باہر آگیا۔

سکندر چند دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ ہال کے دروازے پر فلپ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ بادشاہ کا محافظ دستہ بھی اس کی آمد کا منتظر تھا۔ یکایک شاہ کی آمد کے اطلاعی ساز بجنے لگے۔ لوگ اپنی اپنی جگہ مؤدب کھڑے ہو گئے لوگوں کی نظریں سامنے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں جو ناتراشیدہ پتھروں سے بنایا گیا تھا ساز کی آواز میں تیزی پیدا ہو گئی۔ سفید لباس میں ملبوس فلپ نمودار ہوا۔ لوگ ادھر ادھر ہٹ کر اس کے لئے راستہ بنانے لگے، یونانی ریاستوں کے

مشتریاں اس کے استقبال کے لئے چند قدم آگے بڑھے، محافظ دستے نے بیچ میں حائل ہونا چاہا لیکن فلپ نے انہیں دور رہنے کا اشارہ کیا۔ اس طرح وہ یونانی شرفاء پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ مقدونیہ والوں کو اپنے بادشاہ سے بڑی محبت ہے اور اسے اہل مقدونیہ کا خلوص حاصل ہے۔ اچانک ننگی تلوار لئے ایک آدمی چیختا ہوا آگے بڑھا اور اس نے پوری قوت سے اپنا خنجر فلپ کی پشت میں گھونپ دیا۔ فلپ لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا، یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ لوگوں میں افراتفری پھیل گئی۔ لوگوں نے قاتل کو پکڑ کر اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

یونانی ریاستوں کے سفراء یونانی ریاستوں کے اتحاد سے مایوس ہو گئے کیونکہ ان کی دانست میں جو شخصیت انہیں متحد کر رہی تھی، وہ قتل ہو چکی تھی۔ آناً فاناً ہرکارے، قاصد، تاجر، اور ان کے کارندے قرب و جوار کی ریاستوں میں پھیل گئے اور چاروں طرف یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ مقدونیہ کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔

فلپ کے بعد قبائلی کونسل کے لئے یہ مسئلہ درد سر بن گیا کہ تاج و تخت کا جانشین کسے قرار دیا جائے۔ انہیں سکندر ناپسند تھا وہ کہتے تھے سکندر پڑھتا ہے اور انہیں عالم نہیں سپہ سالار کی ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ خود اولمپیاس یہ بات مشہور کر چکی تھی کہ سکندر فلپ کا بیٹا نہیں ہے لیکن مقدونیہ کے تین بڑے سپہ سالاروں نے سکندر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اور اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ سکندر نے فلپ کی جگہ اقتدار سنبھال لیا، اور اولمپیاس فوراً نئے بادشاہ کی ماں کی حیثیت سے پیلا کے مکان میں داخل ہو گئی۔ قلوپطرہ نے محل خالی کر دیا اور اپنے چچا کے ساتھ کہیں روپوش ہو گئی۔

سکندر برسر اقتدار آگیا۔ اب اس کے سامنے بڑے بڑے منصوبے تھے، یونانی ریاستوں کا اتحاد، شہنشاہ ایران دارا کی گوشمالی اور ایشیا کی تسخیر لیکن اپنے عملی اقدامات سے پہلے وہ اپنے استاد اور سیاسی مشیر ارسطو سے مشورہ ضرور کرنا چاہتا تھا ارسطو نے اسے ایشیا کا رخ کرنے سے منع کیا۔ ارسطو نے کہا "تم مقدونیہ ہی میں رہو اور لاکھوں انسانوں کا خون بہانے کے بجائے یونان کو متحد کرو، اسے خوشحال بناؤ۔ اگر تم انسان پیدا نہیں کر سکتے تو انہیں ہلاک بھی نہیں کرنا چاہیے"

لیکن سکندر کے لئے ارسطو کی نصیحتیں فضول تھیں، فلپ کا لائق ترین سپہ سالار پارمینیو اسے ایشیا کی طرف باگ موڑنے کا مشورہ دے رہا تھا اس کا وفادار جرنیل اور عقلمند مشیر اینٹی پیٹر اس کی عدم موجودگی میں مقدونیہ کا نظم و نسق سنبھالنے کے لئے تیار تھا۔ جب ارسطو نے یہ دیکھا کہ سکندر اس کی بات نہیں مانے گا تو اس نے کہا "اچھا، اگر تم مشرق کی پراسرار زمین فتح کرنا ہی چاہتے ہو تو اس کام کی ابتداء اپنے گھر سے کرو اور یونان کی جو ریاستیں اتحاد کی راہ میں حائل ہیں پہلے انہیں فتح کرو"

سکندر نے ارسطو کا یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اور زیوس دیوتا کے سامنے مٹھی بھر بھر کر عود اور لوبان کی قربانی پیش کر کے تھیبز THEBES کی تسخیر کی تیاری شروع کر دی کیونکہ یہ ریاست ہمیشہ سے مقدونیہ کی مخالفت کرتی رہی تھی۔ سکندر فوج لے کر تھیبز THEBES روانہ ہو گیا لیکن پرسے کو ہدایت دی گیا کہ وہ ایشیا بھیج دیا جائے کیونکہ وہ وہاں کے راستوں سے واقف ہے۔

جب ہلینا کو یہ معلوم ہوا کہ پرسے سکندر کے ساتھ ایران جانے پر آمادہ ہو گیا ہے تو اس کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ پرسے شرمینہ کے لئے ایران جانا چاہتا ہے، وہ پرسے سے فیصلہ کن بات کرنے پہنچ گئی۔ اس موقع پر اس نے غضب کا سنگھار کیا۔ اس کی سنہری زلفیں دو حصوں میں تقسیم ہو کر دونوں شانوں سے گزر کر سینے پر لہرا رہی تھیں چست فراک کو کمر کے گرد پٹی سے کس کر قیامت کا سماں پیدا کر دیا تھا، ٹھوڑی کے نیچے سینہ نیم عریاں تھا۔

ہلینا نے تلخ لہجے میں پرسے کو مخاطب کیا "پرسے! میں تم سے فیصلہ کن بات کرنا چاہتی ہوں"

پرسے نے کہا "تم کچھ بگڑی بگڑی معلوم ہوتی ہو"

ہلینا کچھ رک کر بولی "جب تم اپنی ایرانی محبوبہ کے تصور میں مجھے اپنے سامنے بٹھا کر مجسمہ تیار کر رہے تھے تو میں نے تمہارے سامنے اپنا سب کچھ بے نقاب کر دیا تھا!"

"ہاں مجھے یاد ہے، پھر؟"

"تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میری باتوں میں کوئی چھل فریب نہ ہو تو تم مجھے شرمینہ کی جگہ دے دو گے، پھر تم نے بھی مجھ سے اظہار محبت کیا اور یہاں تک کہ ہم دونوں اسپارٹا جا کر ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا معاہدہ کر چکے ہیں!"

پرسے نے کہا "ہلینا ایران میں سکندر کو میری راہنمائی درکار ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ واپس آکر میں تمہیں ملکہ عالیہ سے حاصل کر لوں گا"

ہلینا نے کہا "یہ وعدہ کسی سپاہی کا نہیں ایک متلون مزاج سنگتراش کا ہے میں اس پر کس طرح یقین کر لوں!"

پرسے نے دل برداشتہ ہو کر کہا "ہم دونوں اس معاملے میں کسی معزز ہستی کو گواہ بنا سکتے ہیں"

ہلینا نے پوچھا "اور اگر تم نے ایران میں شرمینہ کو حاصل کر لیا تو؟"

پرسے نے مذبذب لہجے میں جواب دیا "اس کے ملنے کی امید بہت کم ہے!"

ہلینا نے بات پکڑ لی "لیکن اگر یہ امید پوری ہو گئی تو؟"

پرسے چپ ہو گیا۔

ہلینا نے گفتگو کا انداز ہی بدل دیا "خیر" وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولی "یاد رکھو اگر تم نے شرمینہ کو پا لیا اور اسے لے کر یہاں واپس آئے تو تمہیں جان سے مار دوں گی۔ شرمینہ کو حاصل کرنے کے بعد تم مستقلاً وہیں بس جانا کیونکہ اس کے بعد تمہیں یونان کی سرزمین راس نہ آئے گی"

پرسے اس کی دھمکی پر مسکرانے لگا۔

ہلینا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسکراتی ہوئی بولی "میرا مجسمہ ملکہ عالیہ کے قبرستان والے مکان کے صحن میں فوارے کے قریب ایک سنگی چبوترے پر کھڑا ہے۔ میں نے کئی بار دبے لفظوں میں ملکہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے

کہ اسے وہاں سے اٹھوا لیا جائے لیکن ملکہ اس پر تیار نہیں ہوتیں، اب مجھے ایسا محسوس ہوتا لگتا ہے کہ میرا مجسمہ ہی نہیں بلکہ میں خود بھی قبرستان کے قریب پہنچ چکی ہوں ۔"

اس کے بعد اس نے اپنا سر پرڈمے کے شانے سے ٹکا دیا۔ پرڈمے کے جذبات میں ہلچل مچ گئی اور وہ از خود رفتہ ہو کر ارادہ نہ ہونے کے باوجود نفسی خواہشات کے سیلاب میں بہہ گیا اور یہ بات بالکل فراموش کر بیٹھا کہ اس سرکش اور جنونی لڑکی نے اس کیفیت میں مبتلا کر کے اسے اس بات کا پابند کر لیا ہے کہ جس لڑکی نے اسے اپنا جسم پیش کیا ہے اگر اسے کبھی ٹھکرایا گیا تو وہ اس کے صلے میں ایک نہایت قیمتی شے یعنی زندگی وصول کر لے گی۔

سکندر نے تھیبز THEBES کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ سخت اور ظالمانہ قدم اس نے قصداً اٹھایا تھا اس طرح وہ یونان کی دوسری سرکش ریاستوں کو مرعوب اور خوفزدہ کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یونان کی تمام ریاستیں اس کی قیادت پر متفق اور رضامند ہو گئیں لیکن اسپارٹا اب بھی اس کا مخالف تھا، سکندر نے اس کی پروا کئے بغیر ایشیائے کوچک روانگی کی تیاری تیز تر کر دی۔ اس نے اپنے سپاہیوں اور فوجی جرنیلوں کی مالی حالت کا جائزہ لیا اور جن کے پاس مال و دولت کی کمی تھی ان میں اپنی دولت تقسیم کر دی۔ زمینیں سپاہیوں میں بانٹ دی گئیں۔ سکندر ایشیائے کوچک اور ایران کی تسخیر سے پہلے اپنے ساتھیوں کے دل فتح کر لینا چاہتا تھا۔

ارسطو اسے بار بار یہی سمجھاتا کہ تخریب کے مقابلے میں تعمیر کو بہر حال فوقیت حاصل ہے۔

اس نے اپنی ماں کے پاس اینٹی پیٹر کو چھوڑا اور خود عظیم اور عجیب و غریب صلاحیتوں کے مالک، پارمینو کے ساتھ درۂ دانیال کی طرف بڑھا۔ بادِ شمال نے آبنائے کی موجیں پرسکون کر رکھی تھیں، تیز نگاہیں ایشیائے کوچک کا سرخی مائل ساحل بخوبی دیکھ سکتی تھیں۔ ٹرائے کی پہاڑی بھی صاف نظر آ رہی تھی، پرڈمے کا دل خوشی کے مارے تیز تیز دھڑک رہا تھا، آخر وہ شہر مینہ کی طرف چل پڑا تھا۔ تجارتی جہازوں کے بیڑے اور ماہی گیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں انہیں ٹرائے کی طرف کسی مزاحمت کے بغیر لئے جا رہی تھیں، سکندر زرہ بکتر پہنے سر پہ خود رکھے سراپا اشتیاق بنا ایشیائے کوچک کے ساحل پر نظریں گاڑے کھڑا تھا، اس کا خود دھوپ میں چمک رہا تھا۔

جب یہ لوگ ٹرائے کے ساحل پر کود کود کر اترے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ سنگِ مرمر سے زیوس دیوتا اور تہذیب و تمدن کی دیوی ایتھنیا کی قربان گاہ بنائی اور جی کھول کر شراب لنڈھائی، یہ شراب سونے کے پیالوں سے انڈیلی گئی۔

یہاں سے فارغ ہو کر جب یہ لوگ آگے بڑھے تو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ غنیم کی فوجیں مقابلے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں، سکندر نے فوج دو حصوں میں تقسیم کر دی، ایک حصہ اپنی قیادت میں رکھا دوسرا حصہ پارمینو کی سالاری میں دے دیا۔ فوج میں پرڈمے سنگتراش کے علاوہ ایک کاہن بھی تھا جس نے سکندر کو یہ خوشخبری سنائی کہ تہذیب و تمدن کی دیوی ایتھینا یونانیوں کے ساتھ چل رہی ہے اور ایشیائی آخر مغلوب ہو کر رہیں گے اور جب یہ لوگ دریائے

گرینی کس کے کنارے پہنچے تو سامنے حدِ نظر تک دشمن کی افواج ان کے استقبال کے لئے کھڑی نظر آئیں۔ غنیم یونانیوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا اور چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا "یونانیو! تمہیں کس نے موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے کیا تم غور نہیں کرتے کہ تم نے گھاگھرے پہن رکھے ہیں"۔

سکندر نے تند و سرکش افواج دیکھیں، سیاہ بیوسی فلاس اس کی رانوں میں تھا، اس کا ایک ساتھی اس کا عزم پڑھ چکا تھا، کہنے لگا: "دریا کا دوسرا کنارہ بڑا مخدوش ہے، اگر ہم کسی طرح اس کنارے پر پہنچ بھی گئے تو ساحل کے بے ڈھنگے کنارے ہمیں اوپر نہ چڑھنے دیں گے"۔

سکندر نے تیرہ سو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور یہ کہتے ہوئے گھوڑا دریا میں اتار دیا کہ یہ دریا درۂ دانیال سے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

ایرانیوں نے تیروں کی بارش کر دی، سخت مشکلات کے بعد سکندر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا، اس کے بہت سے ساتھی دریا کے تیز دھارے میں بہہ گئے۔ ایرانیوں نے اسے دم بھی نہ لینے دیا اور اس پر سخت حملہ کر دیا۔ شہنشاہ ایران کے داماد نے اس پر اتنا شدید اور اچانک حملہ کیا کہ اگر سکندر کا ایک ساتھی بروقت اس کا دفاع نہ کرتا تو وہ قتل ہو جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے یونانی دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور انہوں نے ایرانیوں کو اپنے اسلحے کی زد میں لے لیا۔ یونانیوں کے جوش و خروش نے ایرانیوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ شہنشاہ ایران کا داماد سکندر کے ہاتھوں مارا گیا اور ایرانیوں نے راہِ فرار اختیار کی۔

یہاں سکندر نے پہلی بار پروپیگنڈے سے کام لیا، اس نے حکم دیا کہ مرنے والے یونانی جرنیلوں کی شبیہیں کانسی کے ٹکڑوں پر تیار کی جائیں اور وہ میدان جنگ میں بنائے جانے والے ستونوں میں نصب کر دی جائیں تاکہ انہیں مدتوں یاد رکھا جا سکے۔ اس جنگ نے فتوحات کے راستے کھول دیئے اور سکندر شہر سارڈیس پر قبضہ کرتا ہوا ایشیائے کوچک کے بیشتر شہروں پر قابض ہو گیا یہاں تک کہ وہ سلیشیا میں داخل ہو گیا۔ اسے مقدونیہ سے نکلے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ اولمپیاس کے خطوط برابر پہنچ رہے تھے، انہی میں ایک دن ہلینا کا خط بھی موصول ہوا۔ سکندر کی فتوحات نے اسے فکرمند کر رکھا تھا۔ اس نے پردیسی کو لکھا تھا "سنتی ہوں زیوس دیوتا کا بیٹا سکندر ایشیائے کوچک سے گزر کر ایران کے دروازے پر دستک دے رہا ہے، میری دعا ہے کہ دیوتا اسے کامیاب اور تمہیں ناکام رکھیں، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں"۔

ایران کا شہنشاہ دارا چھ لاکھ فوج لے کر سلیشیا کے شہر اسوس پہنچ چکا تھا۔ سکندر بھی تقریباً پچاس ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابل خیمہ زن ہو گیا۔ اس شام ایک عقاب سامنے کی پہاڑی پر آ کر بیٹھ گیا، فوج میں موجود کاہن نے سکندر کو خوش خبری سنائی کہ یہ عقاب فتح مندی کا شگون ہے لیکن سکندر پریشان تھا۔ اس کے سامنے دارا کا عظیم الشان لشکر تھا۔ ایک رات بیچ میں تھی، آنے والی صبح یہ فیصلہ کرنے والی تھی کہ یا تو سکندر ایشیا کا تاج پہن لے گا یا ناکام رہ کر جان دے دے گا۔

دوسرے ہی صبح سکندر اپنے ساتھیوں سے خطاب کر رہا تھا۔

"میرے ہم وطنو! ایشیا تمہیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہے، یہ فوج جو تمہارے سامنے کھڑی ہے، یہ وہی ہے جس نے یونان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، لیکن اب یہ ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ ماضی میں یونانیوں کی تقدیر کے فیصلے ایرانی دربار میں ہوا کرتے تھے لیکن اب ان کی قسمت ہماری مٹھی میں ہوگی۔ دوستو! یہ سرزمین ایشیا ہے، یہاں دولت کی افراط ہے!"

اس کے بعد اس نے ایرانی سرداروں کی طرف دیکھا جو قیمتی زیورات پہنے کھڑے تھے، سکندر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دوستو! آگے بڑھو اور ان عورتوں کے زیور اتار لو"

دفعتہً دونوں طرف سے حملے کے بگل بجنے لگے، دونوں فوجیں ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگیں، سکندر اپنے گھوڑے بوسی فلاس کو ایڑ لگاتا ہوا، دارا کی طرف بڑھا۔ جو اپنے چار گھوڑوں کے رتھ پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا سکندر نے دارا کے محافظوں پر حملہ کر دیا۔ دارا کا بھائی آڑے آیا، اس نے سکندر کے کئی ساتھیوں کو قتل کر دیا لیکن ضدی سکندر دارا کے قریب پہنچ کر ہی رہا اور اس نے رتھ کے گھوڑوں کو زخمی کر دیا۔ گھوڑے رتھ سمیت ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ دارا رتھ سے کود پڑا اور بدحواسی میں ایک خالی گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر میدان سے فرار ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی ایرانی سپاہ کے پیر اکھڑ گئے اور اس بھگدڑ میں کئی لاکھ ایرانی قتل کر دیئے گئے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو میلوں میں پھیلے ہوئے ایرانی خیموں پر معتدونی قابض ہو گئے۔ سکندر دارا کے خیمے میں داخل ہوا تو پاس کے خیمے سے عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ سکندر نے تشویش سے دریافت کیا: "یہ آوازیں کیسی ہیں؟"

کسی نے جواب دیا: "دارا کی ماں اور اس کی بیٹیاں رو رہی ہیں!"

سکندر نے دریافت کیا: "یہ کیوں رو رہی ہیں؟"

سکندر نے اتنی زور سے کہا کہ اس کی آواز عورتیں بھی سن لیں "لیکن تم انہیں یقین دلادو کہ دارا ابھی زندہ ہے اور یہ بھی کہہ دو کہ ان کے ساتھ شایانِ شان سلوک روا رکھا جائے گا۔"

پرمینے کو شبہ گزرا کہ ان عورتوں میں شاید شہزادی بھی موجود ہو لیکن معلومات کیں تو پتہ چلا کہ وہ ہنوز تختِ جمشید میں ہے۔

سکندر فینقیہ کی طرف بڑھا، دارا بابل پہنچ چکا تھا۔ فینقیہ میں اسے دارا کا ایک خط موصول ہوا جس میں ایک بادشاہ نے دوسرے بادشاہ سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کی درخواست کی تھی، لیکن سکندر نے یہ درخواست حقارت سے سترد کر دی۔ اس نے جواب میں دارا کو لکھا: "اب میں ایشیا کا بادشاہ ہوں۔ آئندہ مجھے برابر کا سمجھ کر مراسلہ نہ بھیجنا۔ اگر تمہیں میرے ایشیا کا بادشاہ ہونے میں شبہ ہو تو ٹھہرو، مجھ سے جنگ کرو اور دوبارہ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ تم جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارا پیچھا کروں گا۔"

کچھ دنوں بعد دارا کا ایک مراسلہ موصول ہوا۔ اس نے سکندر سے درخواست کی تھی کہ وہ دونوں شہزادیوں میں سے کسی ایک سے شادی کرلے اور بقیہ شاہی خواتین کو اس کے پاس بھیج دے، اس خط میں سکندر کو اس کے مفتوحہ علاقوں کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔ سکندر نے اپنے جرنیل پارمینیو کے سامنے یہ مراسلہ رکھ دیا اور مشورہ طلب کیا۔ پارمینیو اس مراسلے سے متاثر ہوا کہنے لگا: "اگر میں سکندر ہوتا تو یہ شرائط مان لیتا۔"

سکندر نے فوراً یہ کہہ کر پارمینیو کا مشورہ رد کردیا کہ "ہاں اگر میں پارمینیو ہوتا تو دارا کی شرائط قبول کرلیتا۔"

سکندر نے دارا کو جواب میں دو سطریں لکھ دیں: "اگر تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو تو تم سے شایانِ شان سلوک کیا جائے گا، ورنہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔"

پرسے کو اس خط و کتابت سے وحشت ہورہی تھی اور اس وقت تو یہ وحشت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی جب سکندر خلافِ توقع مصر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں اس نے کافی دنوں قیام کیا اور مصر کے شمالی ساحل پر اپنے نام پر اسکندریہ نامی شہر آباد کیا۔ یونان کو چھوڑے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔

پرسے سوچتا، معلوم نہیں شرمینہ اسے ملے گی بھی یا نہیں، اسی دوران اسے ہلینا یاد آتی اور وہ پچھتاتا کہ کاش میں اس پر اکتفا کرلیتا اور اسے لے کر اسپارٹا کو رنتھ چلا جاتا لیکن پھر شرمینہ اور ہلینا دونوں ہی اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوجاتیں، اور وہ دونوں کے لئے دل میں خلش محسوس کرنے لگتا ہے۔

سکندر مصر سے پلٹا تو بابل کی طرف بڑھا جہاں دارا جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ سکندر کا خیال تھا کہ اب دارا میں شاید جنگ کرنے کی سکت نہ ہوگی لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ بابل کے باہر ایک لشکرِ جرار کے ساتھ اس کے استقبال کو کھڑا ہے تو دل میں تردد اور شکوک نے گھر کرلیا۔ سکندر کے ساتھی بھی خوفزدہ تھے، سکندر نے یہ کہہ کر ان کی ڈھارس بندھائی کہ جس دشمن کو تم اسوس کے میدان میں شکست دے چکے ہو اب وہ ہر جگہ تم سے شکست کھائے گا۔

ان دونوں کے درمیان ایک سلسلۂ کوہ حائل تھا، ایرانی لشکر نشیب میں تھا اور مقدونی فوج پہاڑی کی بلندی پر۔

رات بھر دونوں فوجیں ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کی تڑپ میں جاگتی اور اپنے اپنے اسلحہ تیز کرتی رہیں، صبح ہوتے ہوتے ہی مقدونی لشکر ایرانیوں کے مقابل صف آرا ہوگیا۔ جب سکندر اپنی فوج کے سامنے زرہ بکتر میں غرق، خود پہنے گھوڑے پر سوار معائنہ کررہا تھا تو شاہی کاہن کے ساتھ پرسے اس کے پاس گیا اور لفظ بابل کی بابت ایک معنی خیز بات بتائی۔ اس نے سکندر سے کہا "زیوس کے ناقابلِ تسخیر بیٹے! اس جنگ کے بعد تو بابل میں داخل ہوجائے گا۔ خدا کا دروازہ تجھے خوش آمدید کہنے کے لئے کھل چکا ہے۔"

سکندر نے دریافت کیا "خدا کا دروازہ سے تیری کیا مراد ہے؟"

پرسمے نے جواب دیا "یہ بابل دراصل باب ایل ہے۔ یہاں کی زبان میں باب دروازے کو اور ایل اللہ کو کہتے ہیں یعنی باب ایل کا مطلب ہوا "خدا کا دروازہ"۔

سکندر کو اس انکشاف سے بڑی خوشی ہوئی، سامنے دارا قلب میں، شاہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ رتھ میں سوار تھا۔ رتھوں کی چمک سے آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں، ایرانی فوج کے ایک لاکھ سپاہی دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، سکندر اپنے چالیس ہزار پیادے اور سات ہزار سوار لے کر دارا کی طرف بڑھا یونانیوں کی فوج کا میمنہ سکندر کی کمان میں تھا۔ دفعتہً جنگ کا نقارہ بجا اور دونوں فوجیں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں جنگ کا آغاز رتھوں سے ہوا۔ ایرانیوں کی رتھوں میں بڑے بڑے درانتے بندھے ہوئے تھے اور ان پر سوار نیزہ بردار تھے، یہ رتھ مقدونی لشکر میں گھس گئے اور انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔ نیزہ برداروں کے سامنے مقدونی ڈھالیں حائل ہو گئیں اور ان پر پڑنے والے نیزوں کی ضرب سے خوفناک شور بلند ہوا۔ رتھوں کے گھوڑے بدکنے لگے۔

سکندر دارا کی طرف بڑھا، اس وقت دارا کے ارد گرد ایک ہزار ممتاز سوار اس کی حفاظت کرتے تھے، سکندر نے ان کے حصار توڑنے کے لئے ایک جان توڑ حملہ کر دیا اور انہیں مارتا کاٹتا دارا کے قریب پہنچ گیا۔ مقدونی سپاہ نے رتھوں میں جتے ہوئے گھوڑوں کو تیروں کی باڑ پر رکھ لیا۔ گھوڑے زخمی ہو گئے اور رتھ الٹ گئی۔ دارا بے بسی سے ایک خالی گھوڑے کی طرف بڑھا۔ رتھوں کے الٹنے اور گھوڑوں کے گرنے سے میدان گرد و غبار میں ڈوب گیا۔ دارا نے اس غبار کو اپنے لئے نیک شگون سمجھا اور اس کی آڑ لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔ جب ایرانیوں کو دارا کے فرار ہو جانے کا علم ہوا تو ان کے قدم بھی اکھڑ گئے۔ سکندر اپنی سپاہ کے ساتھ ان میں داخل ہو گیا اور ادھر ادھر دارا کو تلاش کرنے لگا لیکن دارا فرار ہو کر استخر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

سکندر کی نظروں کے سامنے میلوں دور تک ایرانیوں کی لاشیں پھیلی ہوئی تھیں، وہ یہاں سے بعجلت چل کر بابل میں داخل ہو گیا اور یہاں کے دیوتاؤں کو خوشبوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔

سکندر کا اگلا محاذ استخر کا میدان تھا، تخت جمشید، جو دارا کا دارالخلافہ تھا۔ جب مقدونی لشکر استخر کی طرف روانہ ہوا تو پرسمے کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، اشرمینہ یہیں کے محلات میں کہیں موجود، شاید اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پرسمے یہ بھی جانتا تھا کہ اب دارا سے کوئی بڑا مقابلہ نہیں ہو گا۔

جب سکندر بابل سے چل کر استخر کی دیواروں تلے پہنچا تو دارا نے بجھتے والے چراغ کی طرح بھڑک کر مقدونی فوج کے سیلاب کو روکنے کی آخری کوشش کی اور آخر شکست کھا کر ہمدان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب تخت جمشید کے شاہی محلات یونانیوں کے سامنے تھے، پرسمے نے سکندر کے قدموں میں گر کر انہیں بوسہ دیا اور اس آخری فتح کی مبارکباد پیش کی، اس کے بعد وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر کے چکر لگانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ سکندر کسی طرح اسے اندر داخلے کی اجازت

دے دے اور وہ شیرینہ کو تلاش کر کے باہر لے آئے لیکن سکندر نے سختی سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ شاہی بیگمات کی ان کے شایانِ شان عزت کی جائے۔

یہیں اسے اپنے استاد ارسطو کا ایک خط موصول ہوا، اس نے لکھا تھا:۔

"سکندر! دیوتا تجھ پر مہربان ہیں اور تو مسلسل فتوحات حاصل کرتا جا رہا ہے۔ لیکن اس نکتے کو نہ بھولنا کہ فتحمندی کا نشہ شراب کے نشے سے زیادہ سرمست اور بے قابو کر دیتا ہے، مفتوح اقوام سے نہ صرف تم نہایت فراخدلانہ سلوک کرو بلکہ اپنی فوج پر بھی کڑی نظر رکھو کیونکہ مستقبل صرف تمہیں یاد رکھے گا اور تمہاری فوج کی بے سلوکیاں اور مظالمانہ رویّے بھی تمہارے ہی نام پر لکھا جائے گا۔ اس لئے تمہیں کسی ملک کی تسخیر سے زیادہ دشوار یہ کام انجام دینا ہے کہ اپنے نامۂ اعمال میں ان برائیوں کو مت درج ہونے دو جن کا تم سے کوئی تعلق نہیں"۔

اسی لمحے پرشیے بھی اس کے روبرو پہنچ گیا۔ وہ سکندر کے دل میں ترغیب کی ہوا بھر دینا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک محلات میں داخل ہونے سے محروم تھا اور شیرینہ کی یاد نے اسے حد درجہ بے چین اور مضطرب کر رکھا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا: "جناب والا! اب تک تو یہ عاجز خاموش رہا لیکن اب مزید سکوت پریشانی کا موجب ہو رہا ہے"۔

سکندر ارسطو کی ہدایات اور نصیحتوں میں کھویا ہوا تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ پرشیے کیا کہنے والا ہے، اس نے کہا: "ضرور، ضرور لیکن اے خیالی سنگتراش! میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنے والے ہو!"

پرشیے کہنے لگا: "جناب والا! آپ نے یونان میں بھی کوئی شادی نہیں کی، نہ ویسے کوئی عورت رکھی حالانکہ یونان میں چودہ سال کی عمر میں شادیاں ہو جاتی ہیں، اس وقت آپ ایران کے فاتح ہیں اور تختِ جمشید کے محلات آپ کے قبضے میں ہیں آپ ذرا محل سرا میں داخل ہو کر تو دیکھیں وہاں دنیا بھر کا منتخب حسن موجود ہے، آپ کو اس میں اپنے مذاق اور پسند کی عورتیں ضرور مل جائیں گی"۔

سکندر نے حقارت سے جواب دیا: "لیکن پرشیے! میں نہیں چاہتا کہ میں نے جس قوم کے مردوں کو شکست دی ہے ان کی عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہو جاؤں"۔

پرشیے لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔ سکندر نے اپنے آئندہ اقدام کا اعلان کیا: "جب تک دارا زندہ ہے ہمیں اس کا تعاقب جاری رکھنا ہے اور اس کے محلات کی بیگمات کا کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا"۔

اس کے بعد سکندر ایران کے عظیم شہنشاہ سائرس اعظم کی قبر پر گیا۔ سائرس اعظم کے سرہانے لگے ہوئے کتبے پر کندہ تھا۔

"اے فانی انسان! میں کمو جیہ کا بیٹا سائرس ہوں۔ میں نے پارس کی حکومت کی بنا ڈالی اور ایشیا کو فتح کیا۔ میرے مقبرے کو دیکھ اور حسد نہ کر"۔

سکندر کتبے کی عبارت سے بہت متاثر ہوا اور آہستہ سے کہا: "زیوس کا بیٹا سکندر حسد نہیں، تیری پیروی کرے گا اور ایشیا کو فتح کر کے تسخیر اور فتحمندی کی ایک شاندار مثال قائم کرے گا۔"

اس کے فوراً بعد وہ دارا کے تعاقب میں ہمدان روانہ ہو گیا۔ لیکن دارا وہاں بھی نہ ملا یہ ہمدان سے رے اور پھر بحیرہ خزر کے کنارے تک چلا گیا لیکن دارا لاپتہ تھا سکندر اس سے مایوس ہو کر واپس آرہا تھا کہ طہران سے مشہد کی طرف جانے والی سڑک پر اسے معلوم ہوا کہ ایران کی فوج کے تین سپہ سالاروں نے دارا کو گرفتار کر لیا ہے، سکندر تیزی سے اس طرف بڑھا۔ جب ان ایرانی سپہ سالاروں کو سکندر کے تعاقب کی خبر ملی تو انہوں نے دارا کو قتل کر کے اس کے رتھ میں ڈال دیا اور خود فرار ہو گئے۔ سکندر نے جب اس رتھ پر قبضہ کیا تو رتھ چلانے والا بھی اپنے مقتول بادشاہ کو چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا۔ سکندر دارا کی خون آلود لاش دیکھ کر غمگین ہو گیا اور اس بے گور و کفن لاش پر اپنا سرخ لبادہ اتار کر ڈال دیا اور شاہی تزک و احتشام سے اس کی آخری رسوم ادا کرائیں۔

سکندر بجواب تک شرمینہ کے معاملے میں سکوت اختیار کئے ہوئے تھا۔ اچانک پرڈمے سے مخاطب ہوا "پرڈمے! اب میں اس مؤقف میں ہوں کہ شرمینہ کی مرضی معلوم کر کے کوئی فیصلہ دے سکوں۔"

اس کے بعد جب یہ لوگ دوبارہ تخت جمشید واپس پہنچے تو سکندر نے محلات میں شرمینہ کی تلاش کا حکم دے دیا۔ وہاں یہ خبریں سننے کو ملیں کہ اس کے پیچھے چند یونانی افسروں نے محلات کی چند بیگمات کی آبرو ریزی کی ہے۔ سکندر نے معاملات کی تحقیق کی اور جب خبر صحیح نکلی تو جرم میں ماخوذ افسروں کو قتل کرا دیا اور کہا "میں دوسروں کے جرم اپنے نامۂ اعمال میں نہیں لکھوا سکتا۔"

پرڈمے ڈرا کہ اب شاید اصول پسند اور سخت مزاج سکندر شرمینہ کے معاملے میں بھی سختی اختیار کرے گا، بڑی مشکلوں سے شرمینہ تلاش کر کے اس کے سامنے لائی گئی۔ سکندر اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ حیرت سے بولا۔

"ارے! یہ تو ہو بہو ہلینا ہے خوب!" پھر حافظے سے دونوں کا موازنہ کرنے لگا اور بولا۔

"مگر ہلینا زیادہ حسین ہے۔"

پرڈمے نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی اور مختصراً عرض کیا "دونوں ہی حسین ہیں، کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔"

سکندر نے تشویشناک سوال کیا "لیکن تم نے تو ہلینا سے بھی کچھ وعدے کر رکھے ہیں۔!"

پرڈمے شرمینہ کو بھی کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہنے لگا "اے زیوس کے ناقابل تسخیر اور مخیر بیٹے! میں دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ میں شرمینہ کو لے کر یونان چلا جاؤں گا اور تمہاری طرف سے ملکہ معظمہ کے نام ایک سفارشی خط لے جاؤں گا امید ہے ملکہ اپنے عظیم بیٹے کی سفارش رد نہ کرے گی اور ہلینا کو میرے حوالے کر دے گی۔"

سکندر ہنسنے لگا "خوب! یہ فنونِ لطیفہ کے لوگ بڑے عاشق مزاج ہوتے ہیں!" اس کے بعد اس نے شریینہ سے اس کی مرضی دریافت کی، سکندر نے پوچھا "کیوں لڑکی! کیا یہ درست ہے کہ تم اس نوجوان سنگ تراش سے محبت کرتی ہو؟"

شریینہ نے شرم سے گردن جھکالی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

سکندر نے پھر پوچھا "کیا تو پرڈمے کے ساتھ رہنا پسند کرے گی؟"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

سکندر نے پرڈمے کو اجازت دے دی "اب تم اسے لے جا سکتے ہو لیکن خبردار جو تم نے اسے کوئی اذیت پہنچائی!"

پرڈمے نے گھٹنوں کے بل جھک کر سکندر کا شکریہ ادا کیا اور دبی زبان میں عرض کیا "یہ ناچیز یونان واپس جانا چاہتا ہے کیا ملکہ معظمہ کے نام سفارشی تحریر سے بھی اس خادم کو نوازا جائے گا؟"

سکندر نے جواب دیا "تحریر تو تمہیں مل جائے گی۔ لیکن شاید ہلینا اس ایرانی لڑکی کی موجودگی میں تمہارے ساتھ رہنا پسند نہ کرے۔"

سکندر نے اسے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا اور پندرہ دن بعد پرڈمے سکندر سے ایک سفارشی خط لے کر شریینہ کے ساتھ یونان روانہ ہو گیا۔

بحیرہ ایجین عبور کر کے جب پرڈمے خلیج تھسلی میں داخل ہوا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے پریشان حال اور آزردہ خاطر شریینہ کو دوران جدائی کی ساری حکایات سنا ڈالیں اور جب بات ہلینا تک پہنچی تو شریینہ کو رقابت محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا "تم نے اس لڑکی سے شادی کا وعدہ تو نہیں کیا تھا؟"

پرڈمے نے کچھ پس و پیش سے جواب دیا "نہیں!" پھر شریینہ کے دل کو ٹٹولا "لیکن، اگر دو ہم شکل لڑکیاں ایک ہی مکان میں رہیں تو یہ دنیا کا کتنا عجیب و غریب واقعہ ہوگا۔ کیا دو حسین چیزوں سے بیک وقت محبت نہیں کی جا سکتی؟"

شریینہ نے تردد سے جواب دیا "لیکن میں گھر کو تماشا بنانا پسند نہیں کرتی۔" پھر سوال کیا "تم نے اس کا مجسمہ کیوں بنایا تھا؟"

پرڈمے نے جواب دیا "تمہاری یاد میں شریینہ!"

شریینہ نے پھر ایک تشویشناک سوال کر دیا "اس کے مجسمے میں لباس کیسا ہے؟"

پرڈمے ٹپٹا گیا۔ کچھ رک کر بولا "وہ ایک باریک لباس میں ڈھکا ہوا ہے اتنا باریک کہ اس میں سے پورا جسم صاف جھلکتا ہے!" پھر اس نے شریینہ کا تردد دور کرنا چاہا "ایسے لباس کے بغیر جسم کے صحیح نقوش سمجھے کیونکر جا سکتے ہیں!"

شریینہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اور ہاں شاید تم نے مجھے یہ بھی تو بتایا تھا کہ اس لڑکی نے تمہیں یہ دھمکی دی تھی کہ

اگر تم نے اس سے شادی نہ کی تو وہ تمہیں ہلاک کر دے گی۔"

"ہاں!" پرسمے نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "اس نے دھمکی دی تو تھی لیکن عورت کو دھمکی دینے کے سوا آتا ہی کیا ہے!"

پیلا کے محل میں داخل ہوتے ہی اولمپیاس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، اس نے سینکڑوں سوالات کر ڈالے لیکن جب اس نے شربینہ کو دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ سکندر نے شربینہ کو پرسمے کے حوالے کر دیا تو وہ اسکو ڈانٹنے لگی۔ "احمق! میں تو پہلے ہی یہ سمجھ چکی تھی کہ تم اس لڑکی کو دلہن بنا کر لاؤ گے، اب بتاؤ کہ ہلینا کا کیا بنے گا؟"

پرسمے نے سکندر کا سفارشی خط اولمپیاس کے حوالے کر دیا۔ ملکہ نے اس خط کو بار بار پڑھا اور پھر پرسمے کو برا بھلا کہنے لگی۔ "لیکن ہلینا ان حالات میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ رہ سکے گی، کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

اسی لمحے ہلینا بھی سامنے آکر کھڑی ہو گئی، اس نے ان دونوں کو کچھ عجیب نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی آگ روشن تھی۔ ملکہ کی وجہ سے کچھ بھی نہ بولی۔ چپ چاپ واپس چلی گئی، پرسمے نے شربینہ کو ملکہ کے حوالے کر دیا۔ بولا۔ "ملکۂ عالیہ! ناچیز کو خدشہ ہے کہ ہلینا اسے کوئی گزند نہ پہنچا دے۔"

رات کی تاریکی میں ایک پراسرار سایہ پرسمے کے کمرے میں داخل ہوا۔ پرسمے اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا یہ ہلینا تھی۔ اس نے پرسمے کو سخت سست کہنا شروع کیا۔ اور آخر میں کہا۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ملکہ اگر مجھے تمہارے حوالے کر دے گی تو میں کسی جانور کی طرح چپ چاپ تمہارے ساتھ ہو لوں گی۔"

پرسمے نے اسے قائل کرنا چاہا۔ "ہلینا! میں تم سے بھی محبت کرتا ہوں!"

ہلینا نے طنز سے پوچھا۔ "اور اس ایرانی لڑکی سے بھی؟"

"ہاں شربینہ سے بھی!"

"دغا باز!" ہلینا غصے میں بے قابو ہو گئی۔ "تمہارا دل ہے یا سرائے کہ جس کا جی چاہے بس جائے۔" پھر دریافت کیا۔

"کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے دھوکا کیا تو میں تمہیں ہلاک کر دوں گی؟"

"مجھے یاد ہے لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔"

"میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

پرسمے نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔ "اب خیال یہ ہے کہ میں تم دونوں کو لے کر ایتھنز چلا جاؤں اور دنیا کی دو نادر چیزیں گھر میں رکھ کر لوگوں کو حیران کر دوں۔"

"لیکن میں تمہیں پاتال کیوں نہ روانہ کر دوں، جس کا میں نے وعدہ کر رکھا ہے!" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی فراک

میں چھپائے ہوئے خنجر سے پردمے پر حملہ کر دیا۔ پردمے نے اچھل کر وار خالی دیا اور بے تحاشا شور کرنے لگا۔ دالانوں اور غلام گردشوں میں گھومنے والے خدام جب شور سن کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو ہلینا نے اپنے مقصد میں ناکامی اور فرار کی راہ مسدود دیکھ کر خودکشی کر لی اور جو خنجر پردمے کے سینے میں پیوست نہ کر سکی تھی، اسے اپنے سینے میں اتار لیا۔

دم توڑتی ہوئی ہلینا کا سر پردمے نے اپنے زانو پر رکھ لیا۔ خنجر سینے سے نکال کر پھینک دیا۔ کراہتی ہوئی اشکبار ہلینا نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں، لیکن کوئی جذبہ تھا جو اسے پردمے کے زانو سے ہیٹے کی طرف دھکیل رہا تھا اور وہ پردمے میں سما جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اسی کوشش میں اس نے جان دے دی۔

ادلیپاس کو ہلینا کی موت سے بڑا صدمہ ہوا اور اسی کے حکم سے ہلینا کو قبرستان والے مکان کے صحن میں فوارے کے قریب خود اس کے مجسمے کے سائے میں دفن کر دیا گیا۔ پردمے کو بھی اس کی موت کا بڑا غم تھا۔

ایتھنز روانگی سے پہلے وہ شرمینہ کو ہلینا کا مجسمہ ضرور دکھا دینا چاہتا تھا۔ ادلیپاس کے رتھ میں بیٹھ کر وہ شرمینہ کے ساتھ ہلینا کے مجسمے کے پاس پہنچ گیا۔ جب یہ دونوں اس مجسمے کو ادھر ادھر سے گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے تو پردمے کو اچانک احساس ہوا کہ ہلینا کی ایک پنڈلی دوسری سے کچھ موٹی ہے۔ یہ نقص اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ اس نے شرمینہ سے کہا "میں ہلینا کی پنڈلی کے اس نقص کو دور کر دوں گا۔"

دوسرے دن صبح اس نے شرمینہ کو محل میں چھوڑا اور خود سنگتراشی کے آلات کا صندوقچہ لے کر مجسمے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجسمے کے سنگی چبوترے پر چھینی اور ہتھوڑا لے کر چڑھ گیا اور ہتھوڑے کی ہلکی ہلکی ضربیں چھینی پر لگانے لگا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ مجسمہ ہل رہا ہے اور پھر جیسے ہی اس نے چھینی پر ایک زوردار ضرب لگا کر پتھر چھیلنا چاہا مجسمہ منہ کے بل پردمے پر ڈھیر ہو گیا۔ پردمے کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔ رتھ بان دوڑ کر گرے ہوئے مجسمے کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا کہ مجسمے کے نیچے دب کر پردمے کا سر پاش پاش ہو چکا ہے۔ یہ مجسمہ ہلینا کی قبر پر گرا تھا۔ مجسمے کا سر ٹوٹ کر پردمے سے چند قدم دور پڑا تھا لیکن اس کا رخ پردمے کی طرف تھا، جیسے ہلینا پردمے کے عبرتناک انجام اور اپنے انتقام پر مسکرا رہی ہو۔

چنگیز خان کا مدفن

آفندی کو پرانی تہذیبوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن نادر اشیاء جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اس کے چھوٹے سے میوزیم میں بہت سی قیمتی تاریخی اور یادگار چیزیں موجود تھیں قدرت کی طرف سے اسے مذاق ایسا ملا تھا کہ کسی بھی چیز کو دیکھ کر اس کی تاریخی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لینا اس کے لئے ایک نہایت معمولی بات تھی۔ آثار قدیمہ کی مختلف ٹیموں کے ساتھ اس نے دنیا کے مختلف خطوں کا
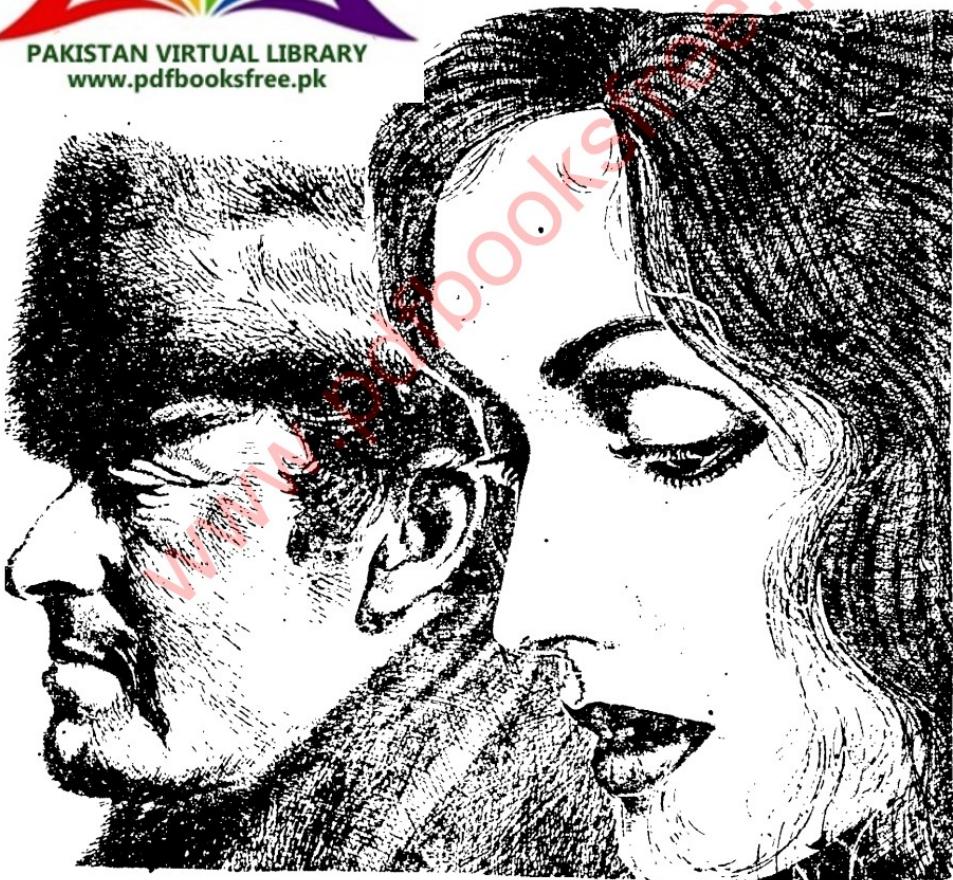
دورہ کیا تھا اس مرتبہ شرقاً غرباً پانچ سو میل کی وسعتوں میں پھیلا ہوا صحرائے گوبی حدِ نظر تک اس کے سامنے تھا۔ پچاس آدمیوں پر مشتمل ٹیم کا چیف حسن برلاس اس توقع پر اس صحرا میں داخل ہوا تھا کہ وہ چنگیز خان کے اصل مدفن کا پتہ چلا کے مورخین کی الجھنیں دور کر دے گا اور اس طرح خود بھی تاریخ کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش کردار بن جائے گا۔ حسن برلاس نے اس مہم میں آفندی کو بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ آفندی کے غیر معمولی مطالعے اور حطانہ کرنے والے مذاق اور نظر کا بہت قائل تھا۔

صحرائے گوبی کے سناٹے میں یہ قافلہ آہستہ آہستہ شمال کی طرف بڑھ رہا تھا اونٹوں پر سامان لدا تھا اور ان کے کجاودں میں ٹیم کے آدمی ہچکولے کھاتے اور بعض صحرائی گیت گاتے اپنا سفر طے کر رہے تھے۔ دوپہر کی جگہ سہ پہر نے لے لی تھی، ایک طرف صنوبر کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ ٹیم کے منگول رہنما نے بتایا کہ درختوں کا یہی وہ جنگل ہے جہاں چنگیز خاں کو دفن کیا گیا تھا۔

یہ جنگل، جس میں برچ اور صنوبر کے درختوں کی بہتات تھی کلوران اور ادنان نامی دو ندیوں کے درمیان واقع تھا۔ حسن برلاس نے اپنی جمعیت کو یہیں روک دیا، خیمے نصب ہونے لگے۔ شام تک یہ کام بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ مقامی حکومت سے کھدائی کی اجازت پہلے ہی لی جا چکی تھی۔ کلوران اور ادنان کی وادی میں جو لوگ آباد تھے ان کے بارے میں سات سو سال سے یہ تاریخی روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آرہی تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں چنگیز خاں کی موت کے بعد اس کی قبر کی حفاظت اور دیکھ بھال کی خدمت سپرد ہونے کی وجہ سے فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، یہ خاندان مدتوں اپنی خدمات بخیر و خوبی انجام دیتا رہا پھر جیسے جیسے حالات سخت ہوتے رہے ان کے کام اور مزاج میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہیں حسن برلاس نے انہی میں سے کچھ لوگوں کو مزدوروں کی حیثیت سے لے لیا۔ ان کی بھنویں کھنچی ہوئی، ناکیں چپٹی، جبڑے بڑے، رنگ صاف اور جسم نہایت مضبوط تھے۔

ان منگولوں کے ساتھ بچوں نے اس ٹیم کو تماشے کی طرح دیکھا۔ ان کے لئے یہ لوگ بڑے مزے کے تھے ان سے گفتگو کرنے کے بعد برلاس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ لوگ اس بات سے بالکل خوش نہیں ہیں کہ یہاں کی کھدائی کی جائے، بعض کی حرکات اور رویے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ مرنے مارنے تک تیار ہیں۔ دو دن ضروری تیاریوں میں لگ گئے۔ تیسرے دن حسن برلاس آفندی اور بعض دوسرے ماہرین آثار قدیمہ کے ساتھ مقامی عمر رسیدہ منگولوں کو لے کر برچ اور صنوبر کے جنگل میں گھس گیا۔ درخت آپس میں اتنے مربوط اور گھنیرے تھے کہ سورج کی روشنی یا چاند کی چاندنی ان میں سے گذر کر اندر نہ پہنچ سکتی تھی۔ ٹارچیں ان کے ہاتھوں میں تھیں، ان کی روشنی میں یہ لوگ اندر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ درندوں کا بھی خوف تھا اور اس کے لئے

ان کے پاس آتشیں اسلحہ تھا۔ ادھیڑ عمر کے مخروطی داڑھی والے منگول رہنما نے حسن برلاس سے کہا:۔
"اتنی بات تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ خان کی قبر اندر کافی دُور ہوگی کیونکہ اس، کو مرے ہوئے کئی صدیاں بیت چکی ہیں۔"
آفندی کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے تائید کرتے ہوئے کہا: "میرا بھی یہی خیال ہے اور اس وقت تک اصل کام نہیں شروع ہوسکتا جب تک کہ تقریباً ایک فرلانگ کی حدود کے درختوں کا صفایا نہ کر دیا جائے۔"
حسن برلاس اور ٹیم کے دوسرے افراد نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور مقامی مزدوروں کے تعاون سے جنگل کے ایک مخصوص حصّے کی کٹائی صفائی ہونے لگی۔ مقامی منگولوں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن انہیں مختلف تدبیروں کے ذریعہ مزاحمت سے باز رکھا گیا۔ جب مقامی منگولوں نے خاموشی اختیار کی تو مخروطی داڑھی والا منگول رہنما کبیدہ خاطر رہنے لگا جیسے جیسے درخت کٹ رہے تھے منگول رہنما متنفر اور ناخوش نظر آتا تھا۔
ان کے خیمے برچ اور صنوبر کے جنگلات سے تقریباً دو فرلانگ دور نصب کئے گئے تھے، اس خیال سے کہ جنگل کے درندے ان پر رات کی تاریکی میں حملہ آور نہ ہوں، خیموں کے آس پاس آگ کے الاؤ ہر شام ہی روشن کر دیئے جاتے تھے اور دس آدمیوں پر مشتمل چوکیداروں کی ایک ٹیم الاؤ کے اندر خیموں کے چاروں طرف گشت کرتی رہتی تھی۔ رات کو جب آفندی اٹھ کر اپنے سموری خیمے سے باہر آیا تو چوکیداروں کے لمبے سائے ان خیموں پر بھوت پریت کے سایوں کی طرح بڑے پراسرار لگتے۔
جس دن جنگلات کے مطلوبہ حصّے کے درختوں کو کاٹ چھانٹ کر جگہ کو کھدائی کے لئے صاف کیا جا چکا تھا اور یہ طے پایا تھا کہ دوسرے دن صبح اس جگہ کے گہرے مشاہدے اور سروے کے بعد کھدائی کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ آفندی کا دل بلاوجہ تیز تیز دھڑکنے لگا تھا، معلوم نہیں وہ ضرورت سے زیادہ پریشان اور انتشارِ ذہن کا شکار تھا۔ اس دن اس نے سرِشام ہی اس بات کی کوشش کی تھی کہ کسی طرح وہ جلد از جلد سو جائے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رات کے دو بجے تک وہ پلک تک نہ جھپکا سکا۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا عجیب عجیب اور ناقابلِ فہم وسوسے اور خدشات اس کے دل میں پیدا ہوتے جا رہے تھے، اس انتشارِ ذہن اور پریشان خاطری کے عالم میں وہ خیمے سے باہر نکل گیا، باہر الاؤ کی روشنی میں چوکیداروں کے متحرک سائے سات صدی قبل کے منگولوں کی روح کی طرح منڈلا رہے تھے، وہ انہیں پوری توجہ اور انہماک سے دیکھتا رہا، وہ انہیں اپنے حافظے میں ایک یادگار منظر کی طرح محفوظ کر لینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ مناظر آنکھیں دوبارہ نہ دیکھ سکیں گی۔ خیموں سے ہٹ کر اس کی نظر بن الاؤ کے اس پار صنوبر کے جنگل کی طرف اٹھ گئیں۔ الاؤ کی روشنی میں اس نے کسی شخص کو خیموں کی طرف آتے ہوئے دیکھا اس کو

تعجب ہوا کہ اتنی رات گئے ان جنگلات سے تن تنہا کون آ سکتا ہے، ابھی وہ اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ آنے والا الاؤ کی حدود کے اندر خیموں کے قریب آ گیا، اس نے رک کر چوکیداروں سے کچھ باتیں کیں اور پھر سیدھا آفندی کی طرف آنے لگا جب وہ بہت قریب آ گیا تو معلوم ہوا کہ یہ منگول رہبر ہے۔ الاؤ کی روشنی میں اس کے چہرے کی درشتی اور بیزاری صاف جھلک رہی تھی۔ اس نے آفندی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور خیمے کے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

خیمے میں آفندی تنہا نہیں تھا، ٹیم کے دو آدمی اور بھی سو رہے تھے۔ منگول فرش پر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں کہنے لگا "آفندی! سنا ہے تمہیں نوادر جمع کرنے کا بے حد شوق ہے"۔

وہ شستہ اردو میں مخاطب ہوا تھا آفندی کو بڑی حیرت ہوئی، غالباً وہ اس کی حیرت کو بھانپ گیا تھا جواب کا انتظار کئے بغیر بولا "مجھے زبانیں سیکھنے کا شوق ہے اردو میں نے ایک ہندوستانی پروفیسر سے سیکھی تھی۔ تاریخ دان اور آثار قدیمہ کے ماہرین جب ان علاقوں میں آتے ہیں تو میں ہی ان کی رہنمائی کرتا ہوں اور کوشش کر کے ان کی زبان ضرور سیکھ لیتا ہوں۔ ہاں تو میں یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا تمہیں واقعی نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے، آفندی نے جواب دیا" ایسا ویسا شوق نہیں بلکہ یہی شوق تو مجھے اس صحرا میں کھینچ لایا ہے"۔

"تب پھر میرا کہنا مانو"۔ منگول رہنما مشفقانہ انداز میں بولا! "حسن برلاس یا اس کے ساتھی جو کچھ کرنے والے ہیں اس میں انہیں ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہ ملے گا مجھے تم پر رحم آتا ہے تم اس وقت میرے ساتھ چلو میں تمہیں چند انتہائی نادر چیزیں دوں گا تم انہیں لے کر حسن برلاس سے علیحدگی اختیار کر لو"۔

"لیکن میں تو اسی ٹیم کے ساتھ آیا ہوں، میں ان سے بچھڑ کر تنہا کس طرح واپس جا سکتا ہوں؟" آفندی نے اس کی بات ماننے سے معذوری ظاہر کی۔

منگول رہبر نے فکرمند نظروں سے آفندی کو دیکھا "اچھا تو پھر حسن برلاس سے لاتعلقی اختیار کر لو اور اس کی کسی بات میں دلچسپی نہ لو"۔

آفندی نے اسے نوادرات کے موضوع پر لانا چاہا "تمہارے پاس کس قسم کے نوادر ہیں اور ان کی مجموعی قیمت کتنی ہوگی؟"

وہ زیر لب مسکرایا اور نہایت استغنا سے جواب دیا "تم اسی وقت میرے ساتھ چلو ان کی قیمت یہ ہوگی کہ ان کو پا کر تم حسن برلاس سے لاتعلقی اختیار کر لو گے"۔

آفندی اس وقت تک بوڑھے منگول سے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک کہ مذکورہ نوادر کو خود نہ دیکھ لیتا اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ لگا لیتا۔

منگول رہنما آفندی کو اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور آفندی کو فوراً آجانے میں تامل تھا لیکن پھر وہ مجبور ہو گیا اور کسی مخفی طاقت کے زیر اثر اسی وقت منگول رہنما کے ہمراہ چل پڑا، جب وہ دونوں چوروں کی طرح خیمے سے باہر نکل رہے تھے تو آفندی کو صرف ایک ہی خوف تھا وہ یہ کہ چوکیداروں کو وہ کیا جواب دے گا، اپنے اس خوف کا اظہار وہ منگول رہنما پر بھی نہ کر سکا۔ جب وہ دونوں الاؤ کی مدد سے بھی باہر ہو گئے تو مخروطی داڑھی والے منگول نے مسکراتے ہوئے کہا، "مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تم کیا سوچ رہے تھے؟ تم سوچ رہے تھے کہ اتنی رات گئے نکلنے پر اگر چوکیداروں نے تمہیں ٹوکا تو تم کیا جواب دو گے؟ بہر حال میری موجودگی میں تم سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔"

الاؤ سے تقریباً ایک فرلانگ دور دو گھوڑے تیار ملے انہیں منگول رہنما پہلے ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے آفندی سے دریافت کیا "کیا تمہیں گھڑ سواری آتی ہے؟"

آفندی نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور پوچھا "کیا تمہیں یقین تھا کہ مجھے لے آنے میں کامیاب ہو گے؟"

منگول نے گھوڑے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا "بالکل! میرے یہاں ناکامی نام کی کوئی چیز نہیں۔" وہ اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، معمول کی طرح آفندی نے بھی اس کی تقلید کی اور گھوڑے کی پشت پر پہنچ گیا اور پھر یہ دونوں گھوڑوں کو سرپٹ بھگاتے ہوئے صنوبر کے گھنیرے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک تو رات، دوسرے گھنیرا جنگل، وہ دونوں گھوڑوں سے اتر کر جنگل میں داخل ہوئے۔ منگول رہنما درختوں کی شاخوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا تیزی سے جنگل میں داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے آفندی تھا ذرا سی دیر کے لئے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے اس وقت یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ اس وقت کوئی درندہ بھی اسے چیر پھاڑ کر سکتا تھا اور اگر درندے سے بچ بھی جائے تو سانپ بچھو اسے گزند پہنچا ہی سکتے تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا منگول رہنما اسے صنوبر اور برچ کے جنگلات میں لئے جا رہا ہے تو وہ ہرگز نہ آتا اور اگر آنے پر مجبور ہی ہو جاتا تو کم از کم حفاظتی اقدامات کا سامان اپنے ساتھ ضرور لاتا۔ راستے میں کئی جگہ نمی آلود ایسی بساند بھی محسوس ہوئی جو یقیناً کسی درندے کے جسم سے پھوٹ رہی ہوگی ایک جگہ شیر بھی دھاڑا جس سے سارا جنگل گونج گیا اور آفندی کی جان حلق میں آگئی، وہ اپنے منگول رہنما سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان ہلانے سے قاصر تھا اور منگول تھا کہ نہایت دلیری سے بڑھا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں تقریباً نصف فرلانگ کی مدد میں کوئی درخت نہ تھا، آفندی نے دل میں حساب لگایا کہ یہ جگہ جنگل کے اندر کتنی دور پر واقع ہے تو پتہ چلا کہ کم از کم ایک میل ضرور ہوگی۔

اس میدان کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر منگول رہنما رک گیا۔ آفندی نے تاروں کی روشنی میں دیکھا کہ یہاں جگہ جگہ گہرے گہرے گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ منگول رہنما ان میں سے ایک گڑھے میں کود گیا اور تھوڑی دیر بعد

کوئی چیز ہاتھ میں لئے اوپر آگیا اور آفندی سے کہنے لگا" آفندی! جب چنگیز خاں مرا تھا تو اس کے بیٹوں نے اس کی قبر پر چالیس حسین عورتوں اور چالیس سفید گھوڑوں کی نذر چڑھائی تھی، ان گڑھوں میں ان کے ڈھانچے آج بھی محفوظ ہیں اگر تم چاہو تو ان نوادر کو اپنے ہمراہ لے جا سکتے ہو۔ کیا ان سے زیادہ تاریخی اور یادگار چیز بھی کوئی ہو سکتی ہے؟"

اپنے ہاتھ کی چیز آفندی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا" ان میں کا ایک سر یہ ہے، کہتے ہیں کہ یہ فنا کی حسین ترین عورت تھی لیکن آج اسی کے سر اور بھیانک جبڑے سے یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ کسی عورت کا سر ہے یا مرد کا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سات سو سال پہلے فنا کی حسین ترین عورت تھی۔"

آفندی کے جسم میں ڈر اور دہشت کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور اس کا جسم بری طرح سنسنا رہا تھا۔ اس نے منگول رہنما کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں پھیکی اور چہرہ بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ آفندی نے بدقت تمام کہا" میں واپس جانا چاہتا ہوں منگول دوست!"

اس نے طنزیہ ہنسی میں جواب دیا" واپس تو میں بھی چلوں گا۔ میں یہاں رہنے تھوڑی آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہیں نوادر جمع کرنے کا شوق ہے۔ میں صرف تمہاری وجہ سے یہاں آیا ہوں ورنہ مجھے یہاں آنے کا شوق بالکل نہیں ہے۔"

پھر اس نے اپنے ہاتھ کا سر زبردستی آفندی کو تھما دیا اور ایک دوسرے گڑھے میں اترتا ہوا بولا" ٹھہرو ایک دوسری یادگار چیز لاتا ہوں۔"

اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک دوسری ہی وضع کا سر تھا اس کی تھوتھنی سی آگے کو نکلی ہوئی تھی، یہ کسی جانور کا سر تھا۔ اس نے یہ سر بھی آفندی کی طرف بڑھایا" اور یہ اس گھوڑے کا سر ہے جس پر چنگیز خاں سفر کیا کرتا تھا۔ خاں کی موت کے بعد اس گھوڑے کو بھی ذبح کر کے اس کی قبر پر چڑھا دیا گیا تھا۔ یہی وہ گھوڑا تھا جس کی پشت پر بیٹھ کر خان نے نصف دنیا کو روند ڈالا تھا اور اسی پر بیٹھ کر اس نے کئی بار صحرائے اعظم گوبی اور قراقرم کی حدود کو قبول کیا تھا۔ اسی گھوڑے سے علاؤالدین خوارزم کا ایران کی حدود سے اس پار تک اور اس کے بیٹے جلال الدین خوارزم کا دریائے سندھ کے کنارے تک تعاقب کیا گیا تھا۔ یہ بڑی یادگار اور تاریخی چیز ہے اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اسے بھی اپنے نوادر خانے میں جمع کر دو۔"

آفندی کا دل للچایا کہ دونوں کاسہ سر نہایت قیمتی اور تاریخی ہیں اور انہیں اپنے نوادرات میں فخریہ جگہ دی جا سکتی ہے بس ایک ہی وسوسہ ایسا تھا جو ذرا آڑے آ رہا تھا۔ اس نے منگول رہنما سے کہا" یہ دونوں سر قیمتی اور نادر ضرور ہیں لیکن اس کا کیا ثبوت کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو حرف بحرف صحیح ہے؟"

منگول نے حد درجہ تحمّل سے جواب دیا "میں خان کے خاندان ہی کا ایک فرد ہوں، مجھ سے زیادہ ان رازوں سے اور کون واقف ہو سکتا ہے؟"

آفندی کی تسلّی اب بھی نہ ہوئی تھی۔ اس نے کہا "یہ تو درست ہے لیکن میں دنیا کو اس بات کا کس طرح یقین دلاؤں گا کہ ان دونوں کا سر سے جو تاریخ وابستہ ہے وہ درست ہے، لوگ تمہاری بیان کردہ روایات پر کس طرح یقین کریں گے۔"

منگول رہنما کو غصّہ آگیا، اس نے درشت لہجے میں کہا "دنیا کو ڈالو جہنم میں، مجھے دنیا سے کیا سروکار، میں تمہیں بھی اس پر مجبور نہیں کرتا کہ تم میری باتوں پر یقین کرو، یقین کرو یا نہ کرو اس سے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

پھر اس نے یہ سر زبردستی آفندی کے حوالے کر دیا، کہنے لگا "کیا تمہارے لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ میں رات کی تاریکی میں اس پُرخطر جنگل میں پا پیادہ اتنی دور تک کسی قسم کا گزند پہنچائے بغیر تمہیں لے آیا ہوں۔ اس جنگل میں بیسیوں قسم کے درندے رہتے ہیں، لیکن یہ خان کا اقبال ہی تو ہے کہ اس کے خاندان کا ایک فرد نہایت دلیری سے تمہیں یہاں تک لے آیا۔ یہ بذاتِ خود ایک نہایت نادر واقعہ ہے جسے لکھ کر تم اپنے نوادر خانہ میں جمع کر سکتے ہو اور سنو میں تمہیں اپنی تصویر بھی دوں گا اس واقعہ کو جہاں لکھنا وہیں میری تصویر بھی چسپاں کر دینا تاکہ لوگ اس عجیب و غریب واقعے کو شک و شبہ کی نظروں سے نہ دیکھیں، میری تصویر بذاتِ خود ایک نادر شے ثابت ہوگی۔"

آفندی نے چنگیز خان کے گھوڑے کا سر بھی منگول رہنما سے لے لیا۔

اس کے بعد وہ ایک نہایت گھنیرے اور وسیع درخت کی طرف بڑھا۔ اس نے اس درخت کی موٹی موٹی شاخوں کو جو زمین سے لگ رہی تھیں پوری قوت سے چیر دیا اور راستہ بنا کر اندر داخل ہو گیا آفندی اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس درخت کے اندر بڑی گنجائش تھی۔ منگول رہنما نے آفندی سے دریافت کیا "کیا موم بتی بھی ہوگی تمہارے پاس؟" آفندی نے نفی میں جواب دیا "نہیں مجھے اگر پہلے سے اس بات کا علم ہوتا تو ضرور لیتا آتا۔"

اس نے دوسرا سوال کیا "ماچس یا لائٹر؟"

آفندی نے جواب دیا "ہاں لائٹر البتہ ہے۔"

منگول نے ہاتھ بڑھایا "ذرا لانا تو۔"

آفندی نے لائٹر جیب سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ منگول رہنما نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر لائٹر سے ایک بڑی سی موم بتی روشن کر دی۔ اس روشنی میں آفندی نے دیکھا وہ دونوں ایک قبر کے برابر

کھڑے ہوئے تھے۔

منگول رہنما نے فخریہ کہا "یہ رہی خان اعظم کی قبر۔ حسن برلاس کئی بار مرے اور پھر جنم لے تب بھی وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک میں موجود ہوں اس کے یہاں تک آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خانِ اعظم بوگدو تھا۔ خدا کا بھیجا ہوا خاص انسان، ایک عام انسان کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ بوگدو کے مزار کی بے حرمتی کرے۔"

آفندی نے محسوس کیا کہ کوئی سایہ مزار کے سرہانے یا پینتانے سے اٹھ کر درختوں کی آڑ میں غائب ہو گیا ہے، منگول رہنما کہتا رہا "اس مزار کی حفاظت پر جنگلی شیر متعین ہیں۔ کیا تم نے ابھی کسی سائے کو یہاں سے اٹھ کر درختوں کے اندر غائب ہوتے ہوئے نہیں دیکھا؟"

آفندی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ قبر کے ایک طرف کدال اور بیلچے پڑے ہوئے تھے۔ منگول رہنما نے ایک کدال اٹھائی اور قبر کے پاس سے جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کا شمار کرنے لگا، بیس قدم پر جا کر رک گیا۔ آفندی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جب منگول رہنما رک گیا تو آفندی نے سوال کیا "یہاں کیا ہے؟"

منگول نے جواب دیا "یہاں ایک بہت ہی قیمتی چیز دفن ہے اور ایک ہی چیز پر کیا موقوف یہاں خانِ اعظم کی بیسیوں یادگاریں دفن ہیں۔"

اس کے بعد منگول رہبر نے کدال چلانی شروع کر دی، کھودتا رہا کھودتا رہا، یہاں تک کہ جب تقریباً چھ فٹ گہرا تین فٹ چوڑا اور تقریباً پانچ فٹ لمبا گڑھا ہو گیا تو وہ اس میں اتر گیا اور اس میں سے ایک گہرے سبز رنگ کے پتھر کا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر اوپر آ گیا۔

اس ٹکڑے کو آفندی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "لو اسے بھی رکھو، یہ خان اعظم کی مہر ہے۔"

اس کے بعد ہنستا ہوا بولا: "اس مہر کی بھی عجیب وغریب تاریخ ہے، بہرحال تم اسے لکھ ضرور لینا۔ جب خان اعظم نے وسط ایشیا کو زیر کر لیا تھا تو ایک دن اس کی خدمت میں کسی شکست خوردہ سردار کا ایک ایسا ساتھی قیدی بنا کر لایا گیا جس کے پاس سونے کا ایک زیور تھا۔

یہ شخص اس زیور کو چھپانا چاہتا تھا لیکن خان کی عقابی نظروں نے اسے دیکھ لیا۔

خان نے اسے دریافت کیا "یہ کیا ہے جس کی تو اس طرح حفاظت کر رہا ہے؟"

یہ شخص شکست خوردہ حکمران کا وزیر تھا اس نے جواب دیا "میری پوری پوری کوشش یہ ہے کہ جب تک میرا آقا زندہ ہے میں اس کی اس امانت کی حفاظت کروں۔"

خان کے دل میں اس شخص نے جگہ بنالی، اس نے کہا "تو وفادار نوکر ہے لیکن تیرا آقا تو مر چکا اس کی ساری

من اور ساری ملکیت اب میرے قبضے میں ہے۔ مجھے بتلا کہ اس زیور سے وہ کیا کام لیتا تھا؟"
اس شخص نے جواب دیا تھا "جب میرا آقا کسی شخص کو کوئی عہدہ دیتا تھا تو اس مہر سے نشان لگا دیتا تھا۔
اور لوگ سمجھ جاتے تھے کہ وہ شخص بادشاہ کا نمائندہ خاص ہے اور اسے فلاں عہدہ تفویض کیا گیا ہے۔"
خان کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی تھی۔ اس نے قیدی کو معاف کر دیا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ خان کے لئے بھی ایک اسی قسم کی مہر تیار کی جائے۔ یہ شخص الیغوری زبان جانتا تھا (الیغوری دراصل ایک شامی زبان تھی) خان اعظم کے لئے مہر ایک گہرے سبز پتھر کی تیار کی گئی۔
اس کے بعد اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے پتھر کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "یہ وہی تاریخی مہر ہے۔ اس پر جو الفاظ کندہ ہیں ان کا اردو ترجمہ ہے "آسمان پر خدا اور زمین پر خدا کی قوت نوع انسان کے بادشاہ کی مہر"
آفندی کے لئے یہ تاریخی واقعات اور حقائق بڑے قیمتی تھے، اس کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ منگول رہنما فرشتہ غیبی تھا جو اس کے لئے نادر ترین چیزیں فراہم کر رہا تھا۔
جب وہ ان چیزوں کو لے کر واپس آیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے اور لوگ بیدار ہو چکے تھے منگول رہنما اس کو الاؤ کے پاس چھوڑ کر جب واپس جانے لگا تو اس نے خود ہی آفندی سے کہا "اور آفندی! تم نے میرا نام نہیں پوچھا؟"
آفندی کو یاد آیا کہ واقعی اس کا نام اور اس سے متعلقہ دیگر تاریخی اور ضروری تفصیلات کا جاننا بہت ضروری ہے۔ آفندی نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا "نام تو پھر بھی معلوم کر لوں گا۔ ابھی تو تم سے ملاقاتیں ہوتی رہینگی"
منگول رہنما ہنسنے لگا "نہیں اب کوئی ملاقات نہ ہوگی۔ میں حسن برلاس کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ سخت نامعقول انسان ہے، میرے باپ کی قبر کھودنا چاہتا ہے اور میری ہی مدد چاہتا ہے، خوب، لیکن اب میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"
آفندی نے دریافت کیا "تم حسن برلاس کی رہنمائی نہ کرو لیکن مجھ سے تو ملاقات ہو سکتی ہے یا مجھ سے بھی نہیں؟"
"تم سے بھی نہیں۔" اس نے دوٹوک جواب دیا۔ "میں کبھی کبھی نمودار ہوتا ہوں اور ہاں تم نوٹ کر لینا میرا نام جوجی ہے۔ چنگیز خاں کے سب سے بڑے لڑکے کا یہی نام تھا۔ خان اسے زندگی بھر حرامی سمجھتا رہا۔ لیکن لطف یہ کہ وہ محبت بھی اسی سے سب سے زیادہ کرتا تھا۔ جوجی، میں جوجی ہوں، اپنے باپ کا سب سے زیادہ چہیتا اور بہادر بیٹا۔ اچھا خدا حافظ۔"
اس نے اپنے گھوڑے کو موڑا اور دوسرے گھوڑے کے جھک کر ایال پکڑ لئے اور پھر دونوں گھوڑوں

کے ساتھ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔ آفندی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آفندی کے ہاتھوں میں دونوں کھوپڑیاں اور مہراب بھی تھے، جب وہ انہیں لے کر اپنے خیمے کی طرف جا رہا تھا تو پارٹی کے لوگ اسے نہایت حیرت اور پریشان کر دینے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آفندی نے اپنے خیمے میں پہنچ کر فوراً ہی ان چیزوں سے متعلق تاریخی واقعات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا۔

آفندی ذہنی اور فکری طور پر کچھ سے کچھ ہو چکا تھا۔ حسن برلاس سمیت پوری ٹیم اس کی نظر میں ہیچ اور کمتر تھی۔ اب وہ قطعی یہ نہ جانتا تھا کہ چنگیز خاں کی قبر کی جستجو کی جائے، وہ خان اعظم کی قبر تک پہنچ چکا تھا۔ یہ خیال اور یہ واقعہ اس کے دماغ کی خرابی کے لئے کافی تھا: وہ کولمبس، واسکوڈی گاما اور اس شخص سے بھی بڑا تھا جس کی قسمت میں ماؤنٹ ایورسٹ کی تسخیر لکھی جا چکی ہو، ماضی، حال اور مستقبل کا وہ تنہا شخص تھا جو چنگیز خاں کی قبر تک پہنچ گیا تھا اور اب ہرگز یہ نہ چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا بھی وہاں تک پہنچ جائے۔ اس کا دماغ اس مہم کو ناکام بنانے کی سازش میں مصروف ہو گیا وہ حسن برلاس کو اس کے ارادوں سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دماغ پہلے سے زیادہ تیز ہو چکا ہے اور یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا دل رحم و مروّت کے جذبے سے محروم ہو چکا ہے۔

دوسری طرف ٹیم کے سربر آوردہ افراد آفندی کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے، انہیں کسی نے بتا دیا تھا کہ آفندی کھدائی کا کام ہرگز نہ ہونے دے گا اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف تدبیریں عمل میں لا رہا ہے حسن برلاس آفندی کو غیر معمولی آدمی ہرگز نہ سمجھتا تھا لیکن جب اس نے آفندی کو دو کاسۂ سر لئے صبح ہی صبح اپنے خیمے میں داخل ہوتے دیکھا تو اس نے اس سے دو نتیجے نکالے۔ اوّل تو یہ کہ آفندی کا شاید دماغی توازن درست نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ وہ یقیناً کوئی پُراسرار شخص ہے اور ٹیم کے پروگرام کے بارے میں اس کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ وہ سیدھا آفندی کے پاس پہنچا اور اس سے رات کی عدم موجودگی کا سبب دریافت کیا۔ آفندی نے جواب دینے کے بجائے رات کے واقعات اور نوادر کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا حسن برلاس کے سامنے رکھ دیا۔ جیسے جیسے وہ اسے پڑھ رہا تھا اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا حسن برلاس اس کو خرافات سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ آفندی کا کسی وجہ سے دماغ ضرور چل گیا ہے

حسن برلاس نے دریافت کیا "یہ جو کچھ تم نے لکھا ہے کیا درست ہے؟"

آفندی نے بلا تامل جواب دیا "بالکل! اور میں اس دنیا میں واحد شخص ہوں جس نے چنگیز خاں کی قبر دیکھی ہے۔"

"اور یہ جوجی؟" حسن برلاس نے مزید استفسار کیا "جوجی تو چنگیز خاں کی زندگی ہی میں مرگیا تھا۔"
آفندی نے جواب دیا "اس سے مجھے کب انکار ہے، مجھے جس شخص نے خانِ اعظم کی قبر تک پہنچایا اور یہ نادر چیزیں میرے حوالے کیں اور اس نے اپنا نام جوجی ہی بتایا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مخروطی داڑھی والا منگول رہنما، اسے تم نے بھی دیکھا ہے۔"
حسن برلاس نے پوچھا "وہ کہاں ہے۔"
"میں نہیں جانتا۔" آفندی نے بے دلی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اب وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ اور اس نے یہ تنبیہہ بھی کی ہے کہ اگر یہ ٹیم اپنے ارادوں سے باز نہ آئی تو اسے انجام کار تباہی اور ہلاکت سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا۔"
"بکواس" حسن برلاس نے رعونت سے کہا "میں اس منگول رہنما کو تلاش کروں گا اور اس وہم کو تمہارے دل و دماغ سے نکال دوں گا۔"
آفندی نے لاپرواہی اور طنز سے جواب دیا "اور اگر اس منگول رہنما کو تلاش نہ کر سکو تو اس عجیب و غریب شخص کی تائید میں چند سطریں ضرور لکھ دینا کیونکہ ان تینوں نادر چیزوں کے ساتھ جوجی سے ملاقات کا بذاتِ خود ایک نادر واقعہ ہے۔"
حسن برلاس نے منگولوں کی بستی میں منگول رہنما کو بے حد تلاش کرایا لیکن وہ نہ ملا اور جب اس بات کی جستجو کی گئی کہ یہ شخص اس ٹیم کو ملا کس طرح تھا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ تو خود ہی ان کے پاس آیا تھا اور حسن برلاس کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ چنگیز خاں کی قبر کے محل وقوع سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ واقف ہے، حسن برلاس جب ہر طرح مایوس ہو گیا تو اسے آفندی کی باتوں پر کچھ نہ کچھ یقین آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر آفندی واقعی خان اعظم کی قبر تک پہنچ چکا ہے تو اس خبر کو حتی الامکان صیغۂ راز میں رکھنا چاہیئے
"شکریہ شکریہ!" آفندی زور زور سے ہنسنے لگا۔ "اپنی چیز کی میں خود جتنی بہتر حفاظت کر سکتا ہوں دوسرا نہیں کر سکتا۔ چھوڑیئے اس موضوع کو اور دوسری باتیں کیجیئے۔"
برلاس کھسیا گیا اور دل میں آفندی کے خلاف حسد و انتقام کی آگ روشن ہو گئی۔ پھر بھی لہجہ کو نرم اور الفاظ میں اعتدال کو برقرار رکھا کہنے لگا۔ "اچھا چھوڑو اس موضوع کو۔ آؤ ہم دونوں ایک دوسرے معاملہ میں سمجھوتہ کر لیں میرا خیال ہے میری یہ پیش کش تمہارے لئے قابلِ قبول ضرور ہو گی۔"
"ارشاد!" آفندی نے شانِ بے نیازی کو برقرار رکھا۔
"میں چاہتا ہوں۔" برلاس کہنے لگا "تم خان اعظم کی قبر تک تو پہنچ ہی چکے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم

دونوں ایک بار پھر وہاں چلیں تو تم وہاں تک بآسانی پہنچ سکو گے؟"
"بالکل، صد فیصد۔ میں نے اس جگہ کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔ جب کہو چلنے کو تیار ہوں"
آفندی برلاس سے بالکل چیف کی طرح باتیں کر رہا تھا۔
برلاس خوش ہو گیا "میری خواہش ہے کہ چنگیز خان کی قبر کو دریافت کر لینے کا سہرا ہم دونوں کے سر بندھے، ہم دونوں تاریخ عالم کے انمٹ کردار بن جائیں گے"
"اس میں کیا شک ہے!" آفندی نے جواب دیا "جب تم چاہو میں چلنے کو تیار ہوں"
برلاس نے کہا "ہمیں اپنے ساتھ اور کتنے آدمی لے جانے ہوں گے"
آفندی نے جواب دیا "یہی کوئی پندرہ بیس افراد۔ ان کے نشانے بہت صحیح ہونے چاہئیں کیونکہ ہمیں جنگل کے جس قطعہ کو عبور کر کے وہاں تک پہنچنا ہے وہ خوفناک درندوں کا مسکن ہے"
"اوہ تم اس کی بالکل پرواہ نہ کرو" برلاس نے مسرت کا نعرہ لگایا۔ "ہر انتظام تمہاری مرضی اور خواہش کے مطابق ہو گا"
جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں آفندی کے خیمے میں سویا ہوا ایک ماہر ارضیات ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور کانوں کو ان دونوں کے باتوں پر لگا رکھا تھا۔
آفندی نے پوچھا "پھر کب چلو گے میرے ساتھ؟"
برلاس نے جواب دیا "میرا خیال ہے کل صبح ہی صبح شکار کھیلنے کے بہانے نکل چلیں"
"بہتر رہے گا" آفندی نے جواب دیا "میں اسی وقت سے تیاریوں میں لگا جاتا ہوں"
برلاس اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ صبح چھ بجے آ رہا ہوں تمہارے پاس"
"بہت بہتر" آفندی نے جواب دیا "انشاء اللہ میں تیار ملوں گا"
برلاس نے سوچا کہ آفندی کو ملا کر کس طرح خان اعظم کی قبر تک پہنچنا چاہیے، اس کے بعد نہایت ہوشیاری سے آفندی کو درمیان سے ہٹا دینا چاہیے۔ خان اعظم کی قبر کو تلاش کر لینے کا سہرا حسن برلاس کے سر بندھنا چاہیے۔ یہ مہم یقیناً اتنی ہی اہم اور تاریخی ہو گی جتنی ماؤنٹ ایورسٹ کی تسخیر یا امریکہ کی دریافت۔
دوسری طرف آفندی یہ سوچ رہا تھا کہ حسن برلاس کو خان اعظم کی قبر کی جستجو سے باز رکھنا بہت ضروری ہے اس مہم کا فاتح آفندی خود بننا چاہتا تھا۔ تاریخی شہرت حاصل کر لینے کا ایک بہترین موقع اس کے ہاتھ اچانک آ گیا تھا، وہ اسے کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آفندی نے یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ حسن برلاس کے دباؤ میں ہرگز نہ آئے گا۔ اور اس سلسلہ میں اگر اس سے حسن برلاس کے قتل کا جرم بھی سرزد ہو جائے تو

وہ تامل سے کام نہ لے گا۔

پروگرام میں تاخیر اور تامل سے پارٹی کے لوگ بہت پریشان تھے اور ہر ذمہ دار شخص اس ٹوہ میں لگا ہوا تھا کہ حسن برلاس اور آفندی میں کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں اور اس کا پارٹی کے پروگرام سے کیا تعلق ہے۔ آفندی کا سکون ختم ہو چکا تھا، اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کی تینوں نادر چیزیں چوری نہ کر لی جائیں۔ اسے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔

تقریباً تین بجے رات کو کوئی شخص چوروں کی طرح اس کے خیمے میں داخل ہوا، آفندی چاقو لے کر کھڑا ہو گیا۔ اور رعب دار آواز میں دریافت کیا "کون؟"

آنے والا برلاس تھا، اس نے سرگوشی میں جواب دیا "میں ہوں حسن برلاس۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"۔

"کرو" آفندی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "لیکن آتنی رات کو بغیر پروگرام بنائے چوروں کی طرح میرے خیمے میں داخل ہونا نیک نیتی کی علامت تو نہیں ہے"۔

"درست" برلاس نے اطمینان سے جواب دیا "اس طرح چوروں کی طرح اچانک آنے میں ایک راز ہے دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا تینوں نوادر کی حفاظت نے واقعی تمہارے سکھ چین اور نیند کو غارت کر دیا ہے۔ تمہیں جاگتا پا کر مجھے دکھ پہنچا تمہیں سونا ضروری چاہیئے"۔

آفندی نے ترش لہجے میں کہا "گراں قدر اور ہمدردانہ مشورے کا شکریہ۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے جاگتے دیکھ کر تمہیں یوں دکھ پہنچا کہ تینوں نوادر تمہارے قبضے میں جاتے جاتے رہ گئے"۔

بخدا میرے دل میں تمہارے لئے نہ تو کسی قسم کی کھوٹ ہے اور نہ تمہارے نوادر کے لئے حرص و طمع۔ اگر تم چاہو تو انہیں میرے پاس محفوظ کرا سکتے ہو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کروں گا"۔

جب برلاس چلا گیا تو آفندی نے چٹکی بجائی اور زیر لب مسکراتا ہوا آپ ہی آپ کہنے لگا "پھنسا شکار گیا کام سے"۔

برلاس نے باہر نکلتے ہی اپنے دل میں کہا "آفندی یہ تیری آخری رات ہے زندگی کی۔ کل چنگیز خاں کی قبر کے آس پاس کہیں بے گور و کفن پڑا ہو گا"۔

دوسرے دن صبح جب برلاس و آفندی بیس آدمیوں کے ساتھ شکار کھیلنے جا چکے تھے تو پارٹی کے سربرآوردہ افراد ان دونوں کی کشمکش اور پروگرام سے واقف ہو چکے تھے۔ تینوں نوادر اور چنگیز خاں کی قبر کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ سبھی کے لئے دلچسپ تھا اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اس مہم کی کامیابی اس کے نام لکھی جائے

اور ان میں کے ہر شخص نے تقریباً ویسا ہی پروگرام بنایا جو برلاس اور آفندی بنا چکے تھے۔ بعض نے آفندی کے خیمے میں اس کے سامان کی تلاشی بھی لی لیکن تینوں نوادر وہ اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ شام کے تقریباً پانچ بجے آفندی واپس آگیا وہ تنہا تھا اور اس کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے، چہرہ لہولہان تھا اور چلنے میں لنگڑا رہا تھا پوچھنے پر یہ معلوم ہوا کہ جنگل کی جھاڑیوں نے تو کپڑے تار تار کر دیئے اور درندوں کے حملوں نے زخمی کر دیا۔ برلاس اور اس کے بیس آدمیوں کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ چنگیز خاں کی قبر تک پہنچ چکے ہیں ایک رات وہیں گزاریں گے دوسرے دن واپس آئیں گے، لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ سبھی کو ہلاک کر چکا تھا اور اب اس کا پروگرام یہ تھا کہ اس پارٹی کو یہیں چھوڑ کر چپ چاپ فرار ہو جائے۔ اس کی باتوں کا اور کسی کو یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن ماہر ارضیات کو اس بات کا یقین تھا کہ برلاس اور اس کے بیس ساتھی ہلاک کئے جا چکے ہیں۔ آفندی کے ہاتھ میں چرمی بیگ تھا ماہر ارضیات ضامن کو یقین تھا کہ تینوں نوادر اسی بیگ میں موجود ہوں گے۔

آفندی اب یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ یہاں سے رخصت ہو کر حکومتِ چین کے محکمۂ آثارِ قدیمہ سے رابطہ قائم کرے گا اور اس کو یقین دلائے گا کہ اس نے چنگیز خاں کی قبر دریافت کر لی ہے، محکمہ اپنے مصارف پر اس کا انتظام کرے تاکہ وہ اس کی نشاندہی کر کے فتح مندی کے اعزاز کا مستحق قرار پائے۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو دنیا کے تمام اخبارات اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کریں گے اور اس کی تصاویر کی جی بھر کے نمائش کی جائے گی۔ چشم زدن میں وہ اتنی شہرت حاصل کرے گا کہ تاریخ میں کہیں اس کی مثال نہ ملے گی۔

اس نے نہایت ہوشیاری سے اپنا سامان سمیٹا اور ایک منگول مزدور پر لدوا کر پیدل ہی رخصت ہو گیا۔ ماہر ارضیات ضامن نہایت ہوشیاری سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ آفندی اپنی ٹیم سے پیچھا چھڑا کر ایک رات کے لئے مزدور منگول کا مہمان ہو گیا اس نے اس مہمانی کا معقول معاوضہ ادا کیا تھا۔ یہ مہمانی بھی ایک رنگین حادثہ ثابت ہوئی مزدور منگول کی نوجوان حسین لڑکی روشنک جو آفندی کی میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی اسے بے حد پسند آئی۔ اور لمحہ بھر کے لئے ایک خواہش ابھری "اگر روشنک اسے مل جائے تو گویا تین نوادر میں چوتھے کا اضافہ ہو جائے گا" اور اس نے یہ طے کر لیا کہ روشنک کو ہر قیمت پر حاصل کیا جائے گا۔

وہ دیر تک منگول مزدور سے باتیں کرتا رہا اور بالآخر اس کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ آفندی کو ایک رات کی بجائے ایک ہفتہ اپنے گھر میں چھپائے رہے، اس دوران وہ حکومتِ چین کے محکمہ آثارِ قدیمہ سے جملہ معاملات طے کر لے گا اور اس کے بعد اس کو جتنا کچھ انعام و اکرام یا اعزاز میں ملے گا اس میں کا ایک معقول حصہ منگول میزبان کی نذر کر دیا جائے گا۔ اس نے سوچا کہ اس درمیان روشنک سے اس کے تعلقات بھی کچھ نہ کچھ استوار ہو جائیں گے،

دوسرے دن علی الصبح ماہر ارضیات ضامن بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ آفندی ٹال جاتا لیکن ضامن نے یہ دھمکی دے دی تھی کہ وہ حسن برلاس اور اس کے بیس ساتھیوں کے قتل کے جرم میں پارٹی کو مطلوب ہے اگر اس نے ٹال مٹول سے کام لیا تو وہ منگول مزدور کے مکان کا محاصرہ کرا کے آفندی کو برآمد کر لے گا۔ اگر آفندی شرافت سے مل لے گا تو اس کی اس کے منصوبے میں مدد کی جائے گی۔ اگر درمیان میں روشنک کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ضامن کی دھمکی کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتا۔ لیکن روشنک کی وجہ سے مجبور ہو گیا اور اس نے ضامن سے ملاقات کر لی۔ ضامن نے اس سے ملتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ "کیا حسن برلاس اور اس کے آدمی واقعی ہلاک کیئے جا چکے ہیں؟"

آفندی نے جواب دیا "وہ میری محنت اور اعزاز میں برابر کی شرکت کا خواہش مند تھا میں اس کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا؟"

ضامن نے کہا "لوگ تمہیں تلاش کر رہے ہیں اگر تم یہاں رہے تو ضرور پکڑے جاؤ گے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے"

آفندی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "اوہ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں ان سب کو تنہا ٹھکانے لگا سکتا ہوں"

ضامن نے آفندی کا دل ہاتھ میں لینا چاہتا۔ "میں تمہارا ساتھ دوں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ حسن برلاس اور اس کے آدمیوں کو تم نے ہلاک کس طرح کیا؟"

آفندی نے ظالمانہ ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "میں نے ان کے پانی میں زہر ملا دیا تھا۔ سم قاتل، جب میں وہاں سے واپس چلا ہوں تو ان میں سے بعض مر چکے تھے اور بعض سسک رہے تھے۔ مجھے اس منظر سے ایک روحانی انبساط حاصل ہو رہا تھا"

ضامن نے لجاجت سے کہا "اچھا تو آفندی میری تم سے ایک درخواست ہے، میں تمہاری ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار ہوں براہ کرم تم اتنا کر دو کہ اس مہم کی کامرانی میں اپنے نام کے آس پاس نزدیک یا دور کسی بھی حیثیت سے میرا نام بھی شامل کر لو!"

آفندی نے رعونت سے جواب دیا: "سوچوں گا"

ضامن نے بے چینی سے مجبور کیا "سوچو گے نہیں بلکہ میری اس خواہش کو پورا کرو گے"

"اچھا" آفندی نے کسی قدر نرمی سے جواب دیا۔

"تمہاری خواہش پوری کر دی جائے گی، تم صرف اتنی مدد کرو کہ حکومت چین کے محکمۂ آثار قدیمہ کے سربراہ سے میری طرف سے جا کر مل لو اور اسے اس پر مجبور کرو کہ وہ ہماری مدد کو آ جائے"

ضامن نے حامی بھر لی۔ آفندی کے کھوٹ آمیز دل نے سوچا کہ ابھی تو ضامن سے کام لے ہی لو بعد میں دیکھا جائے

گا اور ایک آدمی کا راہ سے ہٹانا بھی کوئی کام ہے۔ جب ضامن ہر طرح سے مطمئن ہو کے رخصت ہو گیا تو روشنک نے دریافت کیا "یہ آدمی کیوں آیا تھا؟ اور کیا باتیں کر رہا تھا"

آفندی نے لڑکی پر رعب ڈالنے کے لئے خوب بڑھا چڑھا کر جواب دیا "میں نے ایک اتنا بڑا کام کیا ہے کہ اس سے میرا پوری دنیا میں نام ہو جائے گا اور مجھ پر دولت بارش کی طرح نازل ہوگی کیا تم میری اس دولت اور عزت میں شریک ہونا پسند کرو گی؟"

روشنک نے معصومیت سے سوال کیا "میں اس میں کس طرح شریک ہو سکتی ہوں؟"

آفندی نے دوسرا تیر چلایا "روشنک! تم خانہ بدوشوں کی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور میرا تعلق بھی ترکی کی ایک خانہ بدوش نسل سے ہے ہم لوگ ہمیشہ سے آزاد خیال اور اپنی مرضی کے مالک مانے گئے ہیں تم اگر ذرا سی ہمت کر جاؤ تو میں تمہیں اس مزدور گھرانے سے نکال کر کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہوں۔"

روشنک نے تشویشناک لہجے میں جواب دیا "منگول غیرت مند ہوتے ہیں، یہ تمہارا دنیا کے آخری سرے تک پیچھا کریں گے۔"

آفندی نے تمسخر آمیز انداز میں کہا "ہاں کبھی منگول ایسے ہی ہوتے تھے، لیکن آج کا منگول صحرائے اعظم گوبی کو پار کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔"

"میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔" روشنک نے پلکیں جلدی جلدی جھپکاتے ہوئے جواب دیا "لیکن تم مجھے دھوکہ تو نہ دو گے ——؟"

آفندی نے فوراً کہا "ہرگز نہیں، کبھی نہیں، تم مجھ پر اعتبار کرو۔"

روشنک نے سوال کیا "تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟"

آفندی نے جواب دیا "ایران اور وہاں سے ہندوستان۔"

روشنک تیار ہو گئی آفندی نے ایسا محسوس کیا کہ ساری کامرانیاں تینوں نوادر کی مرہون منت ہیں کیونکہ جب سے یہ چیزیں ہاتھ آگئی ہیں وہ ہر جگہ کامیاب ہوتا جا رہا ہے لیکن کامرانی کا یہ تصور بھی سیمیائی ثابت ہوا۔ تیسری رات ضامن نے اپنی ٹیم کے ساتھ منگول مزدور کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور چیخ چیخ کر پکار پکار کر یہ حکم دیا جانے لگا کہ آفندی کو باہر نکالو، آفندی قاتل ہے اس نے اکیس آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ آفندی قاتل باہر نکل۔" اس وقت مزدور منگول گھر پر نہ تھا وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سربراہ کے پاس آفندی کا پیغام لے کر گیا ہوا تھا۔ اس ہنگامے اور شور و غل کی اصل وجہ روشنک کی سمجھ میں نہ آئی۔ آفندی نے اس سے کہا "روشنک! تم تیار ہو جاؤ ہمیں فوراً ہی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے۔"

روشنک کو تامل ہوا تو آفندی نے اور زیادہ زور دیا۔ "یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے اور میرے سارے خواب منتشر ہو جائیں گے۔ روشنک! کیا تم میرا ساتھ نہ دوگی؟"

روشنک بدرجۂ مجبوری تیار ہو گئی۔ باہر شور و غل بڑھتا جا رہا تھا۔ روشنک نے کہا "میں خیمے کے پچھلے حصّے میں رائفل سے فائر کروں گی لوگ یہ سمجھیں گے کہ تم ادھر سے فرار ہو رہے ہو اور وہ لوگ فوراً پچھلے حصّے کی طرف بھاگ جائیں گے تم فوراً آگے سے نکل کر سامنے کے خیمے میں گھس جانا، وہ میری خالہ کا خیمہ ہے تمہارے پیچھے ہی میں آ رہی ہوں، خالہ تمہیں پہچانتی ہے کچھ بھی نہ کہے گی۔"

اس پروگرام پر پوری طرح عمل ہوا اور آفندی روشنک کی خالہ کے خیمے میں پہنچ گیا۔ روشنک نے بلوائیوں سے کہا کہ "آفندی یہاں سے جا چکا ہے اب بھی چاہو تو پیچھا کر کے اس کو پکڑ سکتے ہو۔"

اس کے بعد وہ خود بھی اپنی خالہ کے خیمے میں پہنچ گئی اور اسی رات وہ دونوں چوری چھپے وہاں سے بھی نکل بھاگے۔ صبح اطلاع ملنے پر منگولوں نے ان دونوں کا تعاقب کیا اور راستے میں ایک جگہ مڈبھیڑ ہو جانے پر آفندی نے کئی منگولوں کو لڑھکا بھی دیا۔ اب آفندی ایسا محسوس کرنے لگا کہ تینوں نوادر اسے بڑی طرح مشکلات اور مصائب میں جکڑتے جا رہے تھے۔

چھپتے چھپاتے بچتے بچاتے یہ دونوں محکمۂ آثار قدیمہ کے سربراہ کے پاس خود ہی پہنچ گئے۔ محکمہ کا سربراہ لیو فانگ انہیں بالکل تخلیہ میں لے گیا۔ اس نے روشنک کو بغور دیکھا اور سوال کیا "کیا تم وہی آفندی ہو جس کا ابھی ابھی مجھے ایک عجیب و غریب پیغام ملا ہے؟"

"جی ہاں وہی آفندی ہوں۔" آفندی نے پورے اطمینان سے جواب دیا۔

لیو فانگ نے روشنک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا "یہ کون ہے؟ اس کے خد و خال تو منگولوں جیسے ہیں۔" آفندی کے پاس اس بات کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ لیکن لیو فانگ نے اس کی مشکل حل کر دی اس نے کہا۔ "مسٹر آفندی! آپ پر کئی جرموں کے ارتکاب کا الزام ہے، آپ نے اپنے اکیس آدمیوں کو زہر دے کر ہلاک کیا پھر آپ نے اپنے منگول مزدور محسن کی لڑکی روشنک کا اغوا کیا اس کے بعد جب آپ کا پیچھا کیا گیا تو آپ نے دو منگولوں کو قتل کر دیا اور یہ سارے جرائم ایسے ہیں کہ آپ کا ایک منٹ کے لئے بھی کھلی دنیا میں رہنا کسی بھی ملک کے قانون کے خلاف ہے۔ آپ کو اس وقت میرے پاس نہیں جیل میں ہونا چاہیئے تھا۔"

آفندی گھبرا گیا اسے جیل سے ڈر نہیں لگتا تھا بلکہ نوادر کے چھن جانے کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔

لیو فانگ نے مزید کہا "تم پہلے مجھے اپنے نوادر دکھلا دو اس کے بعد اور باتیں ہوں گی۔"

آفندی نے بہ جبر و اکراہ نوادر لیو فانگ کے حوالے کر دیئے۔ اس نے ان تینوں چیزوں میں چنگیز خاں کی مہر

کو زیادہ اہمیت دی بلکہ ان کو بکواس اور فضول قرار دیا۔ اس نے ان تینوں چیزوں سے متعلق نوٹ بھی پڑھے اور اس خرافات پر خوب قہقہے لگائے۔ کہنے لگا "تمہارے سارے جرائم اس وقت تک ناقابلِ گرفت رہیں گے، جب تک کہ تم خانِ اعظم کی قبر تک ہمیں نہ پہنچا دو گے۔ اگر تم اپنے دعوے میں پورے اترو گے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے سارے جرائم معاف کر دیئے جائیں گے ورنہ تم سزا کے لئے تیار رہو۔"

پھر ایک نظر روشنک پر ڈالی اور کہا "اور ہاں اگر تم اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تو دوسرے بہت سے اعزازات اور انعامات کے ساتھ یہ لڑکی تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔"

آفندی کو کچھ اطمینان ہوا "لیکن جناب! جب میں آپ کو خانِ اعظم کی قبر تک پہنچا دوں گا تو کیا آپ کا محکمہ ازراہِ انصاف اس بات کا سرکاری طور پر اعلان کرنا گوارا کرے گا کہ خانِ اعظم کی قبر کا پتہ چلانے والوں میں میرا نام سرِفہرست ہے۔"

لیو فانگ نے اس کی بھی حامی بھر لی۔ اس نے سردست تینوں نوادر آفندی کے پاس ہی رہنے دیئے۔

تقریباً بیس دن آفندی نے بڑے سکون سے گزارے، روشنک اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ اکثر تنہائی میں تینوں نوادر دیکھتا رہتا، اسی دوران ایک عجیب و غریب وہم نے اس کے دل میں جگہ بنا لی۔ تینوں نوادر اپنی خصوصیات اور اوصاف کے مطابق حالات پیدا کرتے جا رہے تھے۔

خشا کی حسین ترین عورت کے کاسۂ سر نے اسے روشنک جیسی حسین لڑکی دلوا دی۔

چنگیز خاں کی مہر غالباً یہ کارنامہ انجام دینے والی تھی کہ چنگیز خاں کے مدفن تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد حکومت چین کی مہر سے اس کے اعزاز و اکرام کے پروانے جاری کئے جائیں۔

اس کو ایک دھڑکا اور لگا ہوا تھا اور وہ یہ کہ اس کے یہ تینوں نوادر کہیں حکومت چین اس سے جبراً نہ چھین لے، لیکن وہ انہیں ہر قیمت پر بچانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

لیو فانگ اور آفندی کی قیادت میں سو آدمیوں پر مشتمل ٹیم چنگیز خاں کے مدفن کی تلاش میں روانہ ہو گئی۔ آفندی کو پورا یقین اور اعتماد تھا کہ وہ انہیں اس جگہ پہنچا دے گا جہاں جوجی نے اس کو پہنچایا تھا۔ جب یہ لوگ دریائے کلوران اور اونان کے دوآبے میں پہنچے تو وہاں برچ اور صنوبر کے جنگلات کے سامنے حسن برلاس کے تباہ حال پسماندگان کے آثار میں بچے کھچے خالی خیمے اور خیموں کے قریب الاؤ جلائے جانے کے سیاہ نشانات اور راکھ کے ڈھیر نظر آئے۔ منگول مزدوروں نے انہیں بتایا کہ وہ لوگ اوہام کے شکار ہو کر یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ لیو فانگ نے روشنک کی وجہ سے آفندی کی موجودگی کو راز میں رکھا کیونکہ یہ طے تھا کہ منگول آفندی کو زندہ نہ چھوڑتے۔ لیو فانگ کو یہ خوشی تھی کہ ایک تنہا عظیم اور تاریخی کام اس کی نگرانی میں انجام پا رہا تھا۔ جوجی جس راستے

سے آفندی کو لے گیا تھا اسی راستے سے آفندی لیو فانگ کو لے گیا۔ انہوں نے خان اعظم کی قبر کی جستجو میں پورا دن گنوایا لیکن وہ جگہ نہ ملی۔ لیو فانگ کو اس کی ساری باتیں فراڈ محسوس ہونے لگیں۔ لیکن آفندی بضد تھا کہ وہ خان اعظم کے مدفن تک پہنچ چکا ہے۔ لیو فانگ اس پرخطر جنگل میں میلوں اندر چلا گیا لیکن اسے کوئی ایسا قطعۂ میدان نہ ملا جس کا آفندی نے ذکر کیا تھا۔ دو دن بعد یہ لوگ شرمندہ، نادم اور چڑچڑے آفندی کے ساتھ واپس چلے گئے اب لیو فانگ کا آفندی کے ساتھ رویہ متشددانہ اور نفرت انگیز تھا وہ حراست میں لیا جا چکا تھا اور اس کے تینوں نوادر اب لیو فانگ کے قبضے میں تھے، روشنک بھی چھن گئی اب وہ لیو فانگ کے بس میں تھی۔ آفندی اب بھی مصر تھا کہ اس نے جوچی کی رہنمائی میں خانِ اعظم کی آخری قیام گاہ کو دیکھا ہے اور وہ وہیں کہیں موجود ہے اور لیو فانگ یہ کہتا تھا کہ آفندی پاگل ہو گیا ہے چنگیز خاں کو مرے ہوئے تقریباً سات سو سال گزر چکے ہیں اس کے خفیہ مدفن کا اب کہیں وجود بھی نہ ہوگا۔ تینوں نوادر اور روشنک کے چھن جانے اور ایک متوقع عالمی اور تاریخی شہرت سے محروم رہنے کے صدمات نے واقعی آفندی کو پاگل کر دیا۔ حکومتِ چین نے اس پاگل کو ہندوستان بھیج دیا۔

لیو فانگ کو چنگیز خاں کی مہر کی حقیقت پر کوئی شبہ نہ تھا لیکن بقیہ دونوں کاسۂ سر کے بارے میں وہ سوچتا کہ آخر یہ دونوں ہیں کیا؟ آخر ان تینوں نوادر نے لیو فانگ کو بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ روشنک کے رشتہ داروں نے لیو فانگ کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا اور خود روشنک کو لے کر فرار ہو گئے، ان تینوں نوادر کا شہرہ اتنا پھیلا کہ چیانگ کائی شیک صدر چین کے ایک معتمد خاص نے انہیں حاصل کرنا چاہا لیکن لیو فانگ نے انہیں دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ میں لیو فانگ کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور لیو فانگ کا دماغی توازن بھی جاتا رہا۔ اس سے تینوں نوادر چھین لئے گئے اور چیانگ کائی شیک کے معتمد خاص کی ملکیت میں چلے گئے۔

بعد میں ان تینوں نوادر کے معتمد خاص کے ساتھ ساتھ چیانگ کائی شیک کو بھی اپنے منحوس اثرات کی لپیٹ میں لے لیا اور اسے ماؤ کے لانگ مارچ کے نتیجہ میں چین کی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ آج کل چیانگ کائی شیک فارموسا میں برسرِ اقتدار ہونے کے باوجود جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے اور اس کے معتمد خاص نے کرب اور نفسیاتی دباؤ کے سبب خودکشی کر لی ہے۔

آفندی آج بھی پاگل خانے میں خاموشی اور ایک کھوئے ہوئے انسان کی زندگی گزار رہا ہے، وہ کبھی کبھی بولتا ہے تو صرف اتنا کہ:

"میں تاریخ کا عظیم انسان ہوں اتنا عظیم جتنا کہ کولمبس یا ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والا ہو سکتا ہے، میں نے چنگیز خاں کے مدفن کو دریافت کر لیا ہے، میں دنیا کا وہ واحد شخص ہوں جس نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔"